ماہنامہ

ترجمان القرآن

[illegible]

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)

جلد ۱۱۶ ستمبر ۱۹۹۱ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ **ترجمان القرآن** لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۶ | ستمبر ۱۹۹۱ء - ربیع الاول ۱۴۱۲ھ | عدد ۱

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۲۲۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

اشارات

جماعت اسلامی سے گذشتہ پچاس سال میں اللہ تعالیٰ کے دین کی جو کچھ بھی خدمت بن پڑی ہے — اور یہ خدمت یقیناً اس حقِ جہاد کے مقابلے میں بہت کم ہے جو اللہ کی طرف سے ہم پر عاید ہوتا ہے — وہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید ہی سے ممکن ہوئی ہے۔ مستقبل میں بھی ہم جو کچھ کر سکیں گے، وہ بھی صرف تائیدِ الٰہی ہی سے ممکن ہو گا۔ اس لیے ہم کو سب سے بڑھ کر اس بات کی فکر ہونا چاہیے، اور سب سے بڑھ کر اہتمام اور کوشش اس بات کے لیے کرنا چاہیے، کہ ہم کو ہر وقت اور ہر قدم اللہ تعالیٰ کی بھرپور تائید حاصل رہے، اور ہم کبھی کوئی کام ایسا نہ کریں کہ اس کی تائید سے محروم ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی تائید دو بڑے ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک نصرتِ الٰہی کے ذریعے دوسرے ایک ایسی جماعت کے ذریعے جو ایمان کی بنیاد پر منظم ہو، ایمان کی راہ پر سرگرمِ عمل ہو، اور جس کا ایمان اس شان کا ہو کہ وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی بشارت کی مستحق ہو سکے۔

اسی لیے ہمارے لیے، ہر چیز سے بڑھ کر، یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر فرد، اپنی بساط بھر، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح اور زیادہ سے زیادہ مضبوط اور گہرا کرنے میں لگا رہے۔ "لگا رہے" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ مقصد مسلسل توجہ اور کوشش چاہتا ہے۔ جس لمحہ بھی ہم اس سے غافل ہوں گے، ہم اس تعلق کو کمزور اور ضائع کرنا شروع کر دیں گے۔ اور "بساط بھر" میں نے اس لیے کہا کہ کیفیات تو کسی کے بس میں نہیں، لیکن یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہر کام کرتے ہوئے صرف اللہ تعالیٰ

کی رضا کے حصول کی شعوری نیت کریں۔ شیطان کہیں وسوسہ ڈال دے اور نیت میں آمیزش کر دے، تو وہ قابلِ معافی ہے، مگر جوں ہی اس کا احساس ہو فوراً اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دیا جائے۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہیں ان سے اجتناب کریں۔ شیطان کہیں لغزش اور گناہ میں مبتلا کر دے، تو استغفار اور توبہ کے ذریعہ اس کے عواقب سے بچنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ ہم فرائض ادا کریں، اور اس کی خوشنودی کے دوسرے کام بھی جو فرض نہیں اپنی مرضی سے، رضا کارانہ طور پر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر کریں۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد کو دُنیا کی دوسری محبتوں پر ترجیح دیں۔ اور یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ جب ہم سے کوئی غلطی یا گناہ ہو جائے تو ہم اس پر نادم ہوں، اس کا اعتراف کریں، اس پر ربِ غفور رحیم سے مغفرت طلب کریں، اس کی تلافی کریں اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کریں۔ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

یہ للہیت راہِ حق کے سفر میں بالکل ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ قدم بڑھانا ممکن ہے، نہ منزلیں طے کرنا۔ کوئی بلند بانگ دعوے اور کوئی بھاگ دوڑ اس للہیت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس للہیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کی مضبوطی اور قوت بھی ناگزیر ہے۔

اقامتِ دین کے کام کے لیے منظم جماعتی زندگی کا ناگزیر ہونا ہماری دعوت کا بنیادی جزو ہے۔ جماعتی زندگی کی طرف ہماری دعوت اور جماعتی زندگی کے ہمارے اہتمام کو اس بات میں بڑا دخل ہے کہ جو سفر ۷۵ افراد کی قلیل تعداد سے شروع ہوا تھا، اس میں آج اَن گنت ساتھی شریکِ سفر ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا اور کہا بھی جاتا ہے کہ یہ ملک کی سب سے زیادہ منظم جماعت ہے۔ ایمان کی بنیاد پر قائم ہونے والی اس جماعت کی حفاظت و بقاء، اور توسیع و ترقی کے ذریعے ہی ہم کو تائیدِ الٰہی بھی حاصل ہو سکتی ہے، اور ہم کامیابی سے بھی ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں آئندہ آنے والے مراحل میں ان چیزوں کی خصوصی فکر کرنا چاہیے جن کے اندر جماعت کی

زندگی، حرکت، استحکام اور قوت کا سامان مضمر ہے۔

جماعت کے لیے بھی، فرد کی طرح، سب سے پہلے، اس کی زندگی، استحکام اور قوت کا راز اپنے مقصد کے شعور، اس کے لیے یک سوئی اور اس کے ساتھ وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا مقصود و آرزو ہونا، اس کے لیے جستجو، اور اس ہی کے لیے جستجو، اور اقامتِ دین کے لیے جہاد کی راہ سے جستجو۔ یہ مقصد ہر وقت ہر کام میں ہر سطح پر، ہمارے سامنے رہے۔ اسی میں افراد کے لیے جذبات اور قوتِ متحرکہ کی بیداری اور صحیح راہ پر قائم رہنے کا سامان ہے۔ اور اسی میں جماعت کے لیے زندگی، استحکام اور پیش رفت کی ضمانت ہے۔

ہم کام جو بھی کریں، لگتا ہوں کو اسی مقصود پر جما رہنا چاہیے، اور اِدھر اُدھر نہ بھٹکنا چاہیے۔ انفرادی ملاقات ہو یا تبلیغی کیمپ، اجتماعِ کارکنان ہو یا جلسۂ عام، جلوس ہو یا مظاہرہ، انتخابات ہوں یا پاسبان ریلی ـــــ سب کاموں میں یہی مقصد واضح طور پر، شعور کے ساتھ، دل میں تو لازماً ہونا ہی چاہیے جہاں ممکن ہو وہاں زبان پر بھی۔

ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ مقصودِ اصلی مدہم ہو جائے، دھندلا جائے، یا خدانخواستہ نگاہوں سے محو ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے مقاصد کی آمیزش ہو جائے۔ ہر صورت میں اپنی حفاظت ضروری ہے۔ اور اس خطرہ کا علاج خود احتسابی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جو جماعت یکسو ہو، اپنی یکسوئی کو برابر جانچتی اور پرکھتی رہے، اور یکسو رہے، وہ جماعت اپنی قوت و طاقت کے اصل خزانے اور سرچشمہ سے کبھی نہ کٹے گی، کبھی محروم نہ ہوگی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (بے شک جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب تو صرف اللہ ہی ہے، اور پھر اس پر جم گئے۔ یہی ہماری ساری قوت و طاقت کا خزانہ ہے۔

مقصد کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر اجتماعی کام سے فرد کے جنت میں جانے کا راستہ کھلنا چاہیے، اس کو جنت کے کچھ اور قریب پہنچنا چاہیے اسی طرح وہ آخرت میں وَ اُزْلِفَتِ

الجَنَّةُ لِلمُتَّقِينَ غَيرَ بَعِيدٍ (اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دُور نہ ہوگی) کی بشارت کا حق دار ٹھیرے گا۔ دوسری دُنیا میں ہر اجتماعی سرگرمی سے جماعت کے قدم، اقامتِ دین اور انقلابِ امامت کی منزل کی طرف کچھ آگے بڑھنا چاہئیں ۔ یہ کسوٹی ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ جس اجتماعی کام سے یہ دونوں چیزیں کسی درجہ میں حاصل نہ ہوں، یا قابلِ لحاظ درجہ میں حاصل نہ ہوں، اس کام کو برائے کام کیے چلے جانے کا حاصل شاید ضیاعِ محنت کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسے کام کے بارے میں ہمیں فکر میں پڑجانا چاہیے ایسے کام میں نئی رُوح پھونکنا چاہیے، یا اس کا سانچہ بدلنا چاہیے، یا اس کو ترک کر کے دوسرے کام اختیار کرنا چاہئیں ۔ بے جان مذہبی مراسم کی تو پھر بھی ایک افادیت ہے۔ لیکن خود اپنے اُوپر عاید کردہ بے نتیجہ اور بے ہدف اجتماعی کاموں کے بے جان جسد کو اُٹھائے لیے پھرنے کی افادیت مشکوک ہے۔ جو عمل خدا اور رسول نے مقرر کر دیئے ہیں، ان میں تو اصل چیز اطاعتِ امر ہے۔ اس کا اجر ہے، اور وہ محفوظ ہے۔ جو عمل خود ہم نے اپنے اُوپر فرض کیے ہیں، ان کو مقصد کی اس کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ ورنہ بے جان جسد اُٹھائے پھرنے سے بالآخر حواس اور اعصاب تھکن کا شکار ہوتے جاتے ہیں ۔ حوصلوں کی کمر خم ہوتی چلی جاتی ہے۔ لذت و ذوق رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ اور اپنے اُوپر اپنے ہی عاید کردہ فرائض اصر و اغلال (پیٹھ کے بوجھ اور جسم کی بیڑیاں)، بنتے چلے جاتے ہیں۔

جو کام خالص دینی سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے بھی مقصود و مطلوبِ اصلی کی رُوح نکل سکتی ہے۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج سے۔ یہ بھی صرف عادت، یا اس سے زیادہ صرف دکھاوے کے مراسم بن سکتے ہیں۔ لیکن جو کام بظاہر دینی نہیں نظر آتے اور سمجھے جاتے ۔ مثلاً ہفتہ وار اجتماعات، رپورٹیں، جلسے، جلوس، سیاسی کام ۔ ان میں سے تو مقصد کے شعور، مقصد کی نیت اور مقصد کی لگن کے ضیاع کا خطرہ بہت زیادہ حقیقی ہے۔ اس لیے عوامی اصلاح و دعوت، خدمتِ خلق اور انقلابِ قیادت کے لیے سرگرمیوں جیسے نازک اور پُرخطر کاموں میں جماعت کو زیادہ چوکس و نگران

رہنے کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں مومنین کے ذریعے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کا ذکر فرمایا ہے، وہاں ان مومنین کی قوت کا سرچشمہ صبر کو قرار دیا ہے۔ بیس اگر دو سو پر بھاری ہیں، تو وہی جو صابر ہیں۔ اور ضعف کے آجانے کے بعد بھی، سو کی تعداد دو سو پر غالب آ سکتی ہے، لیکن وہی جو صابر ہیں۔ رَبُّنَا اللّٰہُ کے اقرار کے بعد، گویا اللہ تعالیٰ کو مقصود و مطلوب قرار دینے کے بعد، جو اس مقصد پر استقامت اختیار کریں، ان ہی کے لیے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے۔ استقامت صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ استقامت صبر ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی اور نصرت کے عہد کو ایفا کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر مدد دینے والی جو چیز ہے، وہ بھی صبر ہے۔ دنیاوی سربلندی ہو، یا جنت کے اعلیٰ درجات و مقامات، دونوں صبر کی صفت رکھنے والوں ہی کا حصہ ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ط

(الاعراف - ۷ - ۱۳۷)

(اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا۔ کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔

اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

(المومنون ۲۳ - ۱۱۱)

(آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔)

مصائب اور آزمائشوں کے مقابلہ میں صبر کی اہمیت اور ضرورت تو عام طور پر معروف اور واضح ہے۔ لیکن کم لوگ اس بات کا پورا ادراک رکھتے ہیں کہ جماعت میں افراد کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے، اور ان کے حلقۂ اتصال میں قوت و استحکام پیدا کرنے کے لیے، اور خود جماعت کے لیے اپنی سرگرمیوں میں صحیح راہ پر قائم رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے، صبر کتنا

ناگزیر ہے۔ اس لیے ایمان باللہ، للّٰہیت، اپنے مقصد کے شعور اور اس کے ساتھ وابستگی کے بعد جس دوسری چیز کا اہتمام اور فکر ہمارے لیے ناگزیر ہے، وہ صبر ہے۔

صبر کے معنی ہی باندھنے، روکنے، اور جم جانے کے ہیں۔ اس لیے باہمی تعلقات کے لیے اس سے زیادہ خوب صورت اور موزوں پیرایۂ بیان کیا ہو سکتا تھا جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اختیار کیا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ - (الکہف ۱۸:۲۸)

(اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو)

جماعت میں جو لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں، اسی لیے ساتھ ہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں۔ (يُرِيدُونَ وَجْهَهُ)۔ اور جماعتی زندگی اختیار کرنے میں ان کی غرض بھی یہی ہے کہ وہ رات دن، صبح و شام، ہر وقت اپنے رب کی بندگی کر سکیں۔ اس لحاظ سے اس دیوار میں چُنی جانے والی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے انتہائی قیمتی ہے۔ ہر اینٹ کی اپنی قوت کا، اور پوری دیوار کی قوت کا بھی، انحصار اسی پر ہے کہ خواہ وہ کسی کے اوپر ہو، کسی کے نیچے ہو، کسی کے پہلو بہ پہلو ہو، کسی کا بوجھ اٹھائے، کسی پر بوجھ ڈالے، ہر حالت میں اس کے ساتھ صبر کے سیمنٹ کے ساتھ جڑی رہے۔ صبر اختیار کرے، صبر کی روش پر گامزن رہے۔ صبر نہ ہو تو کوئی چیز باہمی تعلقات کو بگڑنے سے نہیں بچا سکتی۔

سارے انسان اپنی اپنی سوچ، طبیعت، مزاج، افتادِ طبع، جذبات و محرکات، اور علم و عمل، کے لحاظ سے باہم مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں انسان جمع ہوں گے، وہاں ایسی باتوں سے کوئی مفر نہیں جن سے کبھی اختلاف پیدا ہو، کبھی ناگواری ہو، کبھی تکلیف پہنچے، کبھی غصہ آئے، کبھی ناراضگی ہو، کبھی دل خراب ہو جائیں۔ پھر ان چیزوں کے ردعمل میں، شیطان اپنی وسوسہ کاریوں کے ذریعے، ان راہوں پر لے جائے جن پر جانا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے۔ جن سے دل خراب ہوتے ہیں، تنازعات پیدا ہوتے ہیں، تعلقات میں

بگاڑ آتا ہے، یا وہ سرد مہری کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں سے محبت کی شیرینی، شوق، تازگی اور لذت رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ ہر گام، ہر مقام، ہر لمحہ یہ ہمارا صبر ہی ہے جو آگے بڑھ کر ہمارے دل کو، ہماری زبان کو، ہمارے ہاتھ کو تھام سکتا ہے۔ اور انھیں اس حرام میں مبتلا ہونے سے روک سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حرام سے بڑھ کر حرام کیا ہے۔ یعنی مسلمان بھائی کی عزت، اس کا مال اور اس کی جان۔ صبر ہی تعلقات کے اس بگاڑ سے، بچا سکتا ہے جو استرے کی طرح سارے دین ہی کا صفایا کر دیتا ہے۔

کسی بھائی کی کوئی بات ہمیں ناپسند یا ناگوار ہو جاتی ہے، کہیں اختلاف ہو جاتا ہے، کہیں ہماری انا کو ٹھیس لگ جاتی ہے، کہیں کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے، کہیں وہ ہمارے حقوق میں کوتاہی کا مرتکب ہو جاتا ہے، تو دل و زبان اکثر، اور کبھی ہاتھ بھی، جن حرام کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں سے چند سے ہمیں خاص طور پر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے دل بدگمانی سے راہ پکڑتا ہے۔ جن باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور جو صرف وہم و قیاس کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں، ان کو دل سوچ بھی لیتا ہے، ان پر یقین بھی کر لیتا ہے، انھیں اندر بٹھا بھی لیتا ہے، اور کہیں سے سن لے تو فوراً ایمان بھی لے آتا ہے۔ اس لیے کہ بدگمانی کی ریت پر ہی تحقیر، حسد، غیبت، تجسس، تمسخر، تنابز بالالقاب، ہمز جیسے حرام اعمال کے قصر تعمیر ہو سکتے ہیں۔ ایک بھائی کی زبان پر دوسرے بھائی کے خلاف جو باتیں ہوتی ہیں، آپ ان کا جائزہ لیں تو اکثر و بیشتر ان کو بدظنی پر مبنی پائیں گے۔ اکثر ان کی بنیاد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ "اس کے علاوہ اور کیا معنی اور مطلب ہو سکتے ہیں"۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ "میں جانتا ہوں"۔ اور یہ دلیل کافی ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کی نیت کیا ہے"۔ حالانکہ یہ مقام تو صرف علیمٌ بذاتِ الصُّدور کا مقام ہے۔ ایسا کہنا خدائی کے دعوے سے کم مقام کا دعویٰ نہیں۔

دوسری خرابی دل میں تحقیر و استخفاف کا راہ پا لینا ہے۔ وہی اینٹ، خواہ وہ

اُوپر ہو یا نیچے یا پہلو میں ، جو (یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ) اُور اس کے رضا کے طلب گار ہیں"۔ کے مقصد میں شرکت کی بنیاد پر بہت قیمتی اور بہت عزیز ہونا چاہیے ، اور جس سے محبت نہ بھی ہو تو کم سے کم اس کی وقعت اور عزت واحترام اور قدر و قیمت کا احساس تو لازماً ہونا چاہیے ، وہی اینٹ نگاہوں سے گرنا اور دل میں بے وقعت ہونا شروع ہو جاتی ہے ، حالانکہ مسلمان کی تباہی و ہلاکت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ۔ ایک دفعہ بدگمانی کے قصر تعمیر ہونے لگیں ، اور تحقیر و استخفاف کی مہمیز لگ جائے ، تو زبان کی لگام ہاتھ سے نکل جاتی ہے ۔ اور وہ فقرے بازی ، تمسخر ، چغلی ، مجلسوں میں اور نجی گفتگوؤں میں پیٹھ پیچھے غیبت جیسی مہلکات میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ بدگمانی دلیل کی قوت فراہم کرتی ہے ، اور تحقیر و استخفاف ان سارے اعمال کے لیے جواز مہیا کرتے ہیں ۔

انا کو ٹھیس پہنچے ، غصہ آئے ، تکلیف پہنچے ، ناگواری پیدا ہو ، ہر حالت میں ہمیں دل و زبان کو صبر کی لگام دینا چاہیے ۔ اگر اللہ کی رضا ، اس کی مغفرت ، اور جنت جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں ، یہی مطلوب و مقصود ہوں تو وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ کا مقام ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے ۔ سیدھا سیدھا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ طے کر لیں کہ جس بات کو ہم اسلام کے معیار عدل کے مطابق دو آدمیوں کے سامنے ثابت نہ کر سکیں ، جو ہم تک کسی فاسق کے ذریعے پہنچی ہو ، یا کسی قابلِ وثوق ذریعہ سے نہ پہنچی ہو ، جس کی ہم نے تحقیق نہ کی ہو ، جو صرف سنی سنائی ہو ، اس کو ہرگز نہ دل میں جگہ دیں گے نہ زبان پر لائیں گے ۔ ہر مسلمان بھائی کو ، اور خصوصاً اس مسلمان بھائی کو جس نے راہِ حق پر چلنے کے لیے ہمارا ہاتھ تھاما ہے اور ہمارا ساتھی بن گیا ہے ، قیمتی ، وقیع ، معزز و محترم ، اور عزیز جانیں گے ۔ جن کو ہم گفتگوؤں میں ، تقریروں میں اور اسٹیج پر واجب صد احترام قرار دیتے ہیں ، ان کو دل میں بھی محترم رکھیں گے ، اور زبان پر بھی ۔

اگر ہم نے یہ اُصول اختیار کر لیا اور اس کی پابندی کی تو ہم اس بیماری سے بھی اپنا دامن بچا لیں گے جو ہمارے معاشرہ میں بلائے عام کی طرح پھیلی ہوئی ہے ، یعنی بلا تحقیق ،

سُنی سُنائی باتوں کو نقل کرتے پھرنا۔ یہ باتیں ہم نجی گفتگوؤں میں کہیں، تقریروں میں کہیں، اخباروں میں چھپوائیں، فوٹو کاپیاں کر کے تقسیم کریں، ایسا کرنا ہر حال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہوگا کہ" یہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے"۔

انا کو ٹھیس پہنچے، غصہ مغلوب کرے، حسد پیدا ہو جائے، اور بدگمانی اور تحقیر راہ پالیں، تو پھر زبان وہ بیج بوتے لگ جاتی ہے جن کی فصل سر کے بل جہنم میں گرتا ہے۔ یہ زبان ہی ہے، جو سب سے بڑھ کر، اس استرے کا کام کرتی ہے جو سارے دین کو مونڈ ڈالتا ہے اور سارے نیک اعمال کی کمائی اکارت کر دیتا ہے۔ تمسخر ہو، اشاروں کنایوں میں بدگوئی ہو، چغلی ہو، غیبت ہو، تنابز بالالقاب ہو، تجسّس اور کشفِ عیوب ہو، غیبت و بہتان ہو، یہ ایسی حرام چیزیں ہیں جو مُردار، سوّر، اور زنا کی طرح قبیح ہیں۔ سوّر، فحاشی اور حرام غذا سے ہمیں جو گھن آتی ہے، ان سے ہم جس شدت سے اجتناب کا اہتمام کرتے ہیں، ان کا ذکر جس انداز اور مقدار میں ہماری زبانوں پر رہتا ہے، کیا زبان کے لیے حرام کردہ ان چیزوں سے بھی ہمیں اسی طرح یا اس سے زیادہ گھن آتی ہے، اور ان سے بھی ہم اسی طرح، یا اس سے زیادہ اجتناب کرتے ہیں؟ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے بار بار کرنا چاہیے۔

اگر ہم چند سیدھے سادھے اُصولوں کی پابندی کریں تو ان محرمات سے بچنا کوئی دشوار نہیں۔

۱۔ بولیں گے تو بھلی بات بولیں گے، ورنہ خاموش رہیں گے۔

۲۔ بات کریں گے تو عدل کی بات کریں گے۔ اپنی بات ہو یا پرائیوں کی، اپنوں کی ہو یا دُشمنوں کی۔

۳۔ جو بات کریں گے، وہ اچھی، خوبصورت، میٹھی اور نرم بات ہوگی۔

۴۔ کسی کا بھی زبان سے ایسا ذکر نہ کریں گے جس سے اُس کی بُرائی نکلتی ہو، اِلّا یہ کہ ایسے ذکر کے لیے واضح شرعی دلیل موجود ہو۔ اور واضح شرعی دلیل ہو، جب بھی اجتناب ہی کو اولیٰ سمجھیں گے۔

زبان کے استعمال پر یہ پابندیاں بڑے صبر اور عزیمت کا تقاضا کرتی ہیں۔
انسانوں کا مُردار گوشت انسانوں کے لیے بڑی لذت رکھتا ہے۔ زبانیں اس کے چٹخاروں کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے غیبت سے اجتناب کے لیے خصوصی کوشش کی ضرورت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی غیبت کی یہ تعریف کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بھائی کی بُرائی کا وہ ذکر جو اُسے ناگوار ہو، اگرچہ یہ بُرائی اس میں موجود ہو، ------ یا آپ کی بُری رائے ظن و تخمین پر مبنی ہو، یا بلاثبوت و تحقیق قائم کر لی گئی ہو، تو غیبت کے ساتھ بہتان، جھوٹ، ظلم وغیرہ کئی دوسرے گناہ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ علماء نے وہ مواقع متعین کر دیئے ہیں جہاں کسی کی واقعی بُرائی کے ذکر کے جواز کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ غور کیا جائے تو ان سب کا خلاصہ دو باتوں میں ہے۔ ایک یہ کہ کسی دوسرے کو اس کی بُرائی کے ضرر سے بچانا ضروری ہو۔ اس صورت میں اُسی حد تک اجازت ہے جس حد تک بچانے کے لیے ضروری ہے، اور اسی کے سامنے اجازت ہے جس کو بچانا ضروری ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی کے پہنچاتے ہوئے ظلم یا ایذا کا ازالہ، مداوا یا تلافی مقصود ہو۔ اس صورت میں بھی اُسی کے سامنے ذکر کی اجازت ہے جو اس ازالے یا دادرسی کا اختیار رکھتا ہو، اور اُسی حد تک جس حد تک اس مقصد کے لیے ضروری ہو۔ ہم غور کریں تو یہ ایسی سخت شرائط ہیں کہ مشکل سے ہی کسی کی زبان کسی دوسرے کی بدگوئی کے لیے کھل سکتی ہے۔ جہاں کسی فرد یا مجلس کو نہ تو اصلاح و ازالہ کا اختیار ہو، نہ اُس پر اُس کی ذمہ داری آتی ہو، وہاں اس فرد یا مجلس کے سامنے بدگوئی کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ اِسی طرح کسی کے خلاف شکایت، یا اُس کی خرابیاں لکھ کر فوٹو کاپیاں کر کے تقسیم کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے ایسی تحریر گزرتی ہے، نہ تحقیق کی ذمہ داری رکھتا ہے نہ وسائل، نہ وہ اصلاح و ازالہ پر قادر ہے نہ اس کے لیے ذمہ دار۔ یہ تو غیبت کی بدترین شکل ہے۔ اس معیار پر ہمیں اپنی ساری انفرادی اور مجلسی گفتگوؤں کا، اور اپنی تحریروں کا احتساب خود کرنا چاہیے۔ اور ان کو غیبت سے پاک کرنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہماری انفرادی فلاح وابستہ ہے، بلکہ جماعت کی قوت اور استحکام بھی۔

جس طرح باہمی تعلقات میں صبر ناگزیر ہے، اسی طرح جماعتی زندگی کے تحفظ و استحکام کے لیے بھی صبر ناگزیر ہے۔ جماعتی نظام کے تحفظ و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ مشورہ کے وقت ہم اپنی رائے چھپانے کے بجائے کھل کر ظاہر کریں اور کسی کمزوری، مروت، مداہنت یا خوف کا شکار نہ ہوں۔ اپنی رائے پر اس حد تک اصرار نہ کریں کہ افتراق و انتشار کی نوبت آجائے۔ فیصلہ ہوجائے تو اس پر عمل کریں۔ اور اگر دستور عمل نہ کرنے کی رخصت دے تو جماعت کو اس پر عمل کرنے دیں اور اس میں رخنے نہ ڈالیں۔ جماعت کے اکثر و بیشتر فیصلے تدابیر کے زمرہ میں آتے ہیں۔ تدابیر میں اختلاف رائے سے مفر نہیں، اور ہر فیصلہ ہر ایک کے لیے دل پسند نہیں ہوسکتا۔ اپنی پسند یا رائے کے خلاف فیصلے کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہنا اور نہ کرنا جو جائز نہ ہو، صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

مخالفین کے مقابلہ میں مضبوط رہنا، مگر اپنی گفتار و کردار کو شریعت کے دائرہ میں رکھنا بلکہ مکارم اخلاق کی بلندیوں کا اہتمام کرنا، ایک طرف کمزوری اور مداہنت اور بزدلی سے دل کو پاک رکھنا اور دوسری طرف متوازن جذباتیت کا شکار نہ ہونا، ایک طرف اپنی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنا اور اپنی کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنانا اور دوسری طرف عجلت پسندی سے خود کو بچانا ـــــ یہ چیزیں بھی جماعتی استحکام و قوت کے لیے ضروری ہیں، اور یہ بھی صبر ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ (حٰمٓ السجدہ)

اگر ہمارے اندر یہ صبر پیدا ہوجائے تو دشمن کی کوئی قوت اور کوئی تدبیر ہمیں ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا

(آل عمران)

جماعت کی قوتِ مطلوب کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ہمارے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہ ہو، ہمارے ہاتھوں اور زبانوں سے ہمارے بھائیوں کی عزت اور اموال محفوظ ہوں، ہم تعلقات و معاملات کے دائرے میں محرمات سے اسی طرح اجتناب کریں، جس طرح شراب، جوئے، سود اور زنا جیسی محسوس محرمات سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تعلقات میں محبت کی شیرینی ہو، اور یہ رحمت و مودت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گویا ہم باہم رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی تصویر و تفسیر ہوں۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو۔ اور یہ بھی کہ جن سے اللہ تعالیٰ کے واسطے کا تعلق ہو، اللہ تعالیٰ کے نام پر تعلق ہو، اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے تعلق ہو، نصرتِ دین کے لیے تعلق ہو، ان سے بھی محبت کا تعلق ہو، اور گہری محبت کا تعلق ہو۔

رحمت کی صفت تو بہت جامع اور ہمہ گیر ہے۔ اگر ہم نے رحمٰن و رحیم کی بندگی اختیار کی ہے، اور اس کی بندگی کے داعی بھی ہیں، اگر ہم اپنا شمار رحمۃ للعالمین کے متبعین میں کرتے ہیں، اور ان کی سنت اور اسوہ پر چلنے کے مدعی بھی ہیں تو ہماری گفتگو اور روش کو صفتِ رحمت کا مظہر ہونا چاہیے۔ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ قلب میں نرمی اور لینت ہو، گفتگو میں نرمی اور حُسن ہو، برتاؤ میں نرمی اور سہولت ہو۔ یہ سب رحمت کے مظہر ہیں۔ وسعتِ ظرف، عفو و درگذر بھی رحمت کا مظہر ہیں۔ خبرگیری، اعانت و تعاون، غم و تکلیف میں شرکت بھی تعاطف و تراحم کا تقاضا ہیں۔

محبت کے تقاضے کیا ہیں، آداب کیا ہیں؟ کسی کے لیے بھی یہ چیزیں بتانا کچھ ضروری نہیں۔ اس لیے کہ محبت خود ہی استاد ہے، خود ہی راہنما، اور خود ہی دلیل۔ رحمت و محبت کا تعلق سرسری اور سطحی نہیں ہوسکتا۔ اس میں لازماً گہرائی، رنگ اور خوشبو ہوگی۔ جس سے محبت ہو اس کے حال سے ہم غافل نہیں ہوسکتے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے رفیق سے ہمیں محبت ہو، اور برسہا برس اس کے ساتھ کام کرنے کے باوجود ہمیں یہ پتہ نہ ہو کہ اس کی نجی اور خانگی زندگی میں اس پر کیا گذر رہی ہے؟

اگر ایسا ہے تو ہمارا دعویٰ محبت ابھی خام ہے۔

محبت کے ساتھ وہ تمام خرابیاں جمع نہیں ہوسکتیں جن کا ذکر اُوپر ہوچکا ہے۔ محبت ہو تو بدظنی کے بجائے حسنِ ظن ہوگا، تحقیر کے بجائے احترام ہوگا، بدگوئی کے بجائے ذکرِخیر کے مواقع کی تلاش ہوگی، کشفِ عیوب کے بجائے سترِعیوب ہوگا۔

محبت کے رنگ میں رنگ کر ہی ہم تسخیرِعالم کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اگر تسخیرِعالم کا خواب دیکھنے والے خود اپنے ساتھ چلنے والوں کے دل نہ مسخر کرسکیں، تو خالقِ عالم، سارے عالم کو ان کے لیے کیسے مسخر کردے گا۔ محبت پیدا ہوجائے تو چھوٹا سا گروہ بھی بڑے بڑے گروہوں کے لیے مقناطیس بن سکتا ہے۔ مقناطیس کی قوت کا ثبوت نہ اس کے دعوے ہیں، نہ کوئی اور ایسی چیز جسے دیکھا، سُنا، سُونگھا یا چکھا جا سکتا ہو۔ اس کی قوت کا ثبوت تو لوہے کے وہ لاتعداد ذرّے ہیں جو خود بخود کھنچ کر اس کے ساتھ چپک جاتے ہیں، اور چپکے رہتے ہیں۔

جماعت کی قوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم باہمی جھگڑوں، کشمکش اور تنازعات سے زیادہ سے زیادہ پاک رہیں۔ اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ۔ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (الانفال - ۸ - ۴۶)

(اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہوجائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

کئی قسم کے تنازعات ہیں جو جماعتی زندگی میں پیدا ہوتے ہیں، جن سے جماعت کمزور ہوتی جاتی ہے، اور اس کی ہوا اُکھڑتی جاتی ہے۔ ان تنازعات پر بھی صبر کے بغیر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ ایک قسم کے تنازعات تو وہ ہیں جو جماعت سے وابستہ افراد کے درمیان نجی نوعیت کے باہمی معاملات اور برتاؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر وبیشتر

تنازعات تو مالی معاملات میں ہوتے ہیں، لیکن گھریلو زندگی، گفتگو اور برتاؤ سے بھی یہ تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے تنازعات وہ ہیں جو افراد کے درمیان جماعتی زندگی اور معاملات کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کے تنازعات وہ ہیں جو اصحابِ امر اور وابستگانِ جماعت کے درمیان رونما ہوتے ہیں۔

انسان کی فطرت اور اس کے امتحان میں ڈالے جانے کی وجہ سے اس سے مفر نہیں ہے۔ کہ جہاں وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ رہے وہاں تنازعات رونما ہوں۔ کوئی بھی انسانی معاشرہ، خواہ وہ اخلاقی طور پر کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اس علت سے پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ہوا ہے۔ اس لیے تنازعات کے فی نفسہٖ پیدا ہونے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اتنی تعداد میں نہ ہوں کہ جماعت اور وابستگانِ جماعت کی توجہات، اوقات اور وسائل کا معتدبہ حصہ ان تنازعات میں اُلجھنے اور ان کو حل کرنے کی کوشش میں لگتا رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تنازعات سے جماعت کی قوت میں اتنی کمی نہ آنے لگے کہ وہ اپنے مقصد کی طرف پیش رفت جاری نہ رکھ سکے۔ تیسری بات یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تنازعات جلد از جلد حل ہو جائیں۔

تنازعات کا ایک بڑا سبب توقعات کا قائم کرنا اور پھر ان توقعات کا ٹوٹنا ہے۔ ساری انسانی زندگی میں تنازعات کا ایک بڑا سبب یہی ہوتا ہے۔ کاروبار ہوتا ہے تو ایک فریق نفع کی ایسی اُمید دلاتا ہے جو پوری نہیں ہوتی۔ یا دوسرا فریق جتنے نفع کی اُمید قائم کرتا ہے وہ بھی پوری نہیں ہوتی۔ توجہ اور برتاؤ و گفتگو سے شکایات کا بڑا سبب بھی شکستہ امید ہی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔

وَاَجْمِعِ الْيَاْسَ مِمَّا فِیْ اَيْدِی النَّاسِ

(مشکوٰۃ شریف کتاب الرقاق)

فنا ہونے والی مخلوق سے ان چیزوں کی توقع جو خود بھی فنا ہونے والی ہیں وہ کیوں رکھے جس کا مقصود و مطلوب وہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے!

مالی وکاروباری معاملات میں تنازعات کا سبب اگر کسی ایک فریق کی بد دیانتی ہے تو اس کا علاج سوائے اصلاحِ احوال اور توبہ و استغفار کے اور کچھ نہیں۔ لیکن بالعموم ان تنازعات کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ باہمی شرائط واضح طور پر طے نہیں کی جاتیں، ان کو باہمی اعتماد کی وجہ سے لکھا نہیں جاتا۔ (جو اعتماد ذرا سا بال پڑنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے)۔ کئی چیزیں ہر فریق ازخود اپنے ذہن میں فرض کر لیتا ہے۔ غیر واضح اور مبہم شرائط اور مفروضات کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاملے کی کشتی بہت جلد باہمی تنازعات کے بھنور میں پھنس جاتی ہے، اور اس کا تختہ تختہ الگ ہونے کی نوبت آجاتی ہے۔ حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ہر معاملہ لکھ لیا جائے۔ اور اس تحریر پر گواہ بھی ہوں۔ شرائط واضح اور مکمل ہوں، اور ان کی نوعیت ایسی ہو کہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔ اگر ہم معاملات میں ہمیشہ ان احکام کی پابندی کریں تو بہت سے تنازعات پیدا نہ ہوں گے۔ یا اگر پیدا ہوں گے تو آسانی سے سلجھنے کے امکانات ہوں گے۔

اس ضمن میں ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی سامنے رکھنے چاہئیں جن میں فی نفسہٖ جھگڑے پیدا کرنے، اور جھگڑوں پر اصرار کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، اور خود کو برحق جاننے کے باوجود جھگڑا ختم کرنے کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہو جانے پر جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات کی بشارت دی ہے۔

جماعتی زندگی کے معاملات میں تنازعات کی صورت میں بھی چند اصولوں کی پابندی سے تنازعات کم بھی ہو سکتے ہیں، اور جو ہوں وہ جلدی سلجھ بھی سکتے ہیں۔ اوّل تو اپنے نفس کے لیے کوئی تنازعہ نہ اٹھانا چاہیے، نہ اس کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارا سارا کام تو رضائے الٰہی کی خاطر ہے۔ دوسرے یہ کہ جس سے تنازعہ ہو، سب سے پہلے اس سے ہی گفتگو کرنا چاہیے، اس سے پہلے کہ ہم کسی نجی گفتگو میں، یا کسی مجلس میں، اس کی شکایت کریں یا اپنا کیس فوٹو کاپی کر کے ہر کس و ناکس تک پہنچا دیں۔ دوسرے مرحلے پر آپ اس معاملے کو صرف اس شخص کے سامنے پیش کریں، جو اس میں اصلاح کرنے کے لیے ذمہ دار و مختار ہو۔ جن لوگوں کو اصلاحِ احوال کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، یا جنھیں

اس معاملہ میں کوئی اختیار نہ ہو، اُن کے سامنے گلہ وشکایت کرنا غیبت کی تعریف میں آجائے گا۔ اگر تحقیق اور اصلاحِ احوال کے لیے ذمہ دار افراد کے سامنے بات رکھنے سے بھی تنازعہ حل نہ ہو، تو پھر تیسرے مرحلہ میں ایسے اجتماعی فورم میں بات رکھیں جو اس کو حل کرنے کے لیے ذمہ دار اور مجاز ہو۔ اگر اسی ترتیب سے تنازعہ حل کرنے کی کوشش کی جائے، اور کسی مرحلہ میں بھی کسی غیر متعلق فرد کو اس میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کی جائے تو بہت سے تنازعات حل ہو جائیں گے۔ اور جو حل نہ ہوں گے ان کا فساد اپنے دائرہ سے باہر نہیں پھیلے گا۔ اس ترتیب وار کوشش سے بھی اگر کوئی تنازعہ حل نہ ہو تو پھر سب سے بہتر راہ صبر کی راہ میں ہر قدم پر یہی صبر درکار ہے۔ لیکن اس صورت میں تو عزم و محبت کا یہ کردار اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا محبوب ہے۔ اسی لیے اس نے لَا تَنَازَعُوا (جھگڑا نہ کرو) کے متصل ہی "وَاصْبِرُوْا" کی ہدایت فرمائی۔

مختلف سطح پر جماعت کو چلانے کے لیے ذمہ دار رفقاء اگر صبر و سکون اور ہمدردی سے اپنے رفقاء کی بات سننے کا ظرف اور حوصلہ پیدا کریں اور اپنے برتاؤ کو انصاف، نرمی اور عفو و درگذر پر قائم کریں تو ان کے اور ان کے ساتھ چلنے والے رفقاء کے مابین تنازعات بھی کم سے کم ہوں گے۔

جماعت کی قوت کے لیے ذمہ داروں میں کیا اوصاف ہونے چاہییں، اور ذمہ داران اور ان کے ساتھیوں کے درمیان تعلقات کن بنیادوں پر قائم ہونا چاہییں، ان سے باخبر ہونا، اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ ہمارے لٹریچر میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہوا موجود ہے اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

حکمتِ سیدمودودیؒ

کثرتِ تعداد یا قابلِ اعتماد و کردار والے لوگ

جو چیز میں نے جماعت کی تشکیل میں پیشِ نظر رکھی وہ یہ تھی کہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہیے جو نہ صرف عقیدے میں مخلص ہوں، بلکہ اپنی انفرادی سیرت و کردار میں بھی قابلِ اعتماد ہوں۔ میرے ۲۲ سال کے مشاہدات یہ بتا رہے تھے کہ مسلمانوں کی جماعتوں اور تحریکوں کو جس چیز نے آخر کار خراب کیا وہ اچھے لوگوں کے ساتھ بہت سے ناقابلِ اعتماد لوگوں کا شریک ہو جانا تھا۔ تحریکِ خلافت میں بڑے بڑے نیک اور فاضل اور بہترین اخلاق کے لوگ شامل تھے۔ لیکن ایک کثیر تعداد اس میں ایسے کارکنوں کی بھی آکر شامل ہو گئی تھی جو سیرت و کردار کے لحاظ سے ناقص تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے اعمال سے تحریک کو بدنام کیا۔ اپنے بہترین لیڈروں کو بدنام کیا۔ مسلمانوں نے جو لاکھوں کروڑوں روپیہ جمع کر کے اس کارِ خیر کے لیے دیا تھا، اس کا اچھا خاصا حصہ ان غلط کارکنوں کے ہاتھوں خورد برد ہوا۔ اور ایک مدتِ دراز تک مسلمانوں میں چندے کا نام لینا مشکل ہو گیا کیونکہ عوام سے چندہ لے کر کام کرنے والے کارکنوں کا اعتماد اس بری طرح مجروح ہو چکا تھا کہ مخلص اور نیک نیت کارکن بھی اگر کسی اچھے کام کے لیے لوگوں سے مالی مدد طلب کرتے تھے تو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ چندہ کھا جائیں گے۔ انہی مشاہدات کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی کہ اصل اہمیت کثرتِ تعداد کی نہیں بلکہ قابلِ اعتماد سیرت و کردار رکھنے والے کارکنوں کی ہے۔ خواہ تھوڑے ہی افراد ملیں، مگر بہر حال ہماری جماعت صرف ایسے لوگوں پر مشتمل ہونی چاہیے جن میں سے ایک ایک فرد کی سیرت قابلِ اعتماد ہو۔ جس کے قول اور عمل پر لوگ بھروسہ کر سکیں، جس کے ہاتھ میں مسلمان اپنا مال اطمینان کے ساتھ دے سکیں اور ان کو پورا یقین ہو کہ جس کام کے لیے یہ مال اس کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہے اسی کام میں صرف ہو گا۔

(جماعتِ اسلامی کے ۲۹ سال)

آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کے چند گوشے

جناب پروفیسر حافظ محمد یسین صاحب ۔ انجنیئرنگ کالج ۔ ٹیکسلا

تاریخِ انسانی میں چھٹی صدی عیسوی کو اس اعتبار سے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا عظیم الشان واقعہ ظہور میں آیا ۔ اس زمانے میں مختلف ملکوں کے حکمران بڑے بڑے پُرشکوہ خطابات کے ساتھ حکمرانی کی مسندوں پر متمکن تھے ۔ اور لوگ ان کے قہر و جبروت سے ہر وقت لرزہ براندام رہتے تھے ۔ یونان کے شہنشاہ کو بطلیموس کے لقب سے پکارا جاتا تھا ، ترکوں کا حکمران خاقان کے لقب سے سرفراز تھا ۔ فارس کے فرمانروا کو کسریٰ کا لقب عطا ہوا تھا ۔ روم کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا ۔ اور ملک حبش کے شہنشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا ۔

حکمرانی کے اعتبار سے یہ نہایت جبر و ستم کا دور تھا اور اس عہد کی پوری انسانیت ان شخصی حکومتوں اور مطلق العنان فرمانرواؤں کے تشدد و مظالم کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی ۔ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی اور کوئی ان کے حضور گردن اونچی کر کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا ، سب کے سر جھکے ہوئے اور نگاہیں نیچی رہتی تھیں ۔

اس دورِ تاریک اور عہدِ غلامی میں حضرت محمد مصطفٰے خلیفۃ اللہ اور رسول اللہ کے مقدس و مطہر خطابات سے سرفراز ہو کر دنیا میں تشریف لائے اور ان کو چونکہ انسانی معاشرہ میں مبعوث کیا گیا تھا ۔ لہٰذا وہ " محمد اً عبدہٗ و رسولہٗ " کہلائے ۔ مطلب یہ تھا کہ لوگ ان سے مانوس ہو جائیں اور یہ حقیقت ان کے ذہن میں راسخ ہو جائے کہ یہ انسان ہیں اور انہیں

اللہ نے انسانوں کی طرف رسول اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ انہی کے ذریعے سے صحت مند انسانی معاشرہ پیدا ہوگا، انہی کی جدوجہد سے انسانوں کی قسمت بدل جائے گی اور انہی کی تبلیغ سے انسانیت کا سر اُونچا ہوگا اور ان میں ایسی سیاسی بیداری کروٹ لے گی جو رُوحانیت سے مالا مال ہوگی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بعثت سے کفر کی تاریکی ختم ہوئی اور اسلام کا سُورج طلوع ہوا، ظلم وستم نے رختِ سفر باندھا اور عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہوا۔ غرور و تکبر کے صنم کدے منہدم ہوئے اور دُنیا میں اعتدال و توازن کی فضا پیدا ہوئی، حکومت کے ایوانوں سے شخصی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اسلامی جمہوریت اور دینی سیاست نے کروٹ لی۔ بُت پرستی کا پُرانا قلعہ زمین بوس ہوا اور اس کے بجائے اللہ کے صاف ستھرے قوانین و احکام کا بول بالا ہوا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کرۂ ارض خدا کے نازل کردہ فرامین و ارشادات سے منوّر و تاباں ہوگیا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ سب سے پہلے سطحِ ارض پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد ان قوانین و احکام نے اپنی جھلک دکھائی جو اللہ کی طرف سے نازل فرمائے گئے اور انسانی فطرت کے ہم آہنگ ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ معاشرہ وجود میں آیا جس نے اپنے پیغمبر کے حکم سے ان قوانین پر عمل و کردار کی بنیادیں استوار کیں۔ یہ ایسا پاکیزہ معاشرہ تھا جو اس سے قبل نہ چشمِ فلک نے دیکھا تھا اور نہ زمین کی پلیٹھ کبھی اس قسم کے لوگوں سے آشنا ہوئی تھی۔ وہ ایک مثالی معاشرہ تھا اور اس کا ہر فرد خیر و برکت کی بے پناہ دولت سے بہرہ ور تھا۔ یہ معاشرہ صرف تیئیس سال کی مختصر ترین مدت میں زمین پر جلوہ گر ہوگیا تھا۔ اب پُرانے تصورات، پُرانی روایات اور پُرانی اقدار جن کا رُوحانی پاکیزگی اور اسلامی سیاست سے کوئی علاقہ نہ تھا، سب ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی جگہ اسلام کا دَور شروع ہوا۔ اسلام کی حکومت قائم ہوئی۔ اسلام کا نظامِ اجتماعی عالمِ وجود میں آیا۔ اور ہر سُو خیر ہی خیر نظر آنے لگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے ابتدائی دَور ہی سے یہ حقیقت واضح ہونے لگی تھی کہ رُوحانی پاکیزگی و طہارت کے ساتھ ساتھ ان میں حکومت کی ذمہ داری

اور دُنیا کی سیاسی قیادت و امامت کے آثار بھی بہ درجہ اتم موجود ہیں اور جس مذہب اسلام کی آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں وہ دُنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر اُبھر گا۔ اور انسانیت کی بھلائی صرف اسی کی اتباع میں ہے۔

انسانی زندگی میں خواب کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ آنحضرتؐ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پیدائش سے قبل خواب میں ایک سُنہری زنجیر دیکھی جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس خواب کی یہ تعبیر دی کہ اُن کی نسل میں ایک ایسی برگزیدہ شخصیت پیدا ہوگی جس کے زیرِ فرمان اہلِ مشرق بھی ہوں گے اور اہلِ مغرب بھی، یعنی تمام لوگ کسی نہ کسی انداز میں اس کے اطاعت گذار ہوں گے[1]

اِسی طرح آپؐ کی والدہ مکرمہ آمنہ بنت وہب نے آپؐ کی ولادت سے پہلے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر یہ دی گئی کہ اُن کے ہاں ایک ایسا بچہ جنم لے گا جو ایک دُنیا کا سردار ہوگا[2]

ایک شخص خالد بن سعید نے آنحضرتؐ کی پیدائش سے کئی سال بعد خواب دیکھا کہ بئر زمزم سے روشنی کا فوّارہ بلند ہو رہا ہے — چنانچہ آنحضرتؐ نے جب اپنی نبوّت کا اعلان فرمایا اور اُمتِ مُسلمہ معرضِ تنظیم میں آنے لگی تو خالد بن سعید صرف اس خواب کی وجہ سے اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے[3]

آنحضرتؐ جس سال پیدا ہوئے وہ واقعۂ فیل کا سال تھا یعنی یمن کا حبشی حکمران ابرہہ ہاتھی پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کے لیے آیا۔ لیکن قانونِ خداوندی کا اس طرح ظہور ہوا کہ اس نے شکست کھا کر واپسی کی راہ لی۔ یہ واقعہ ابرہہ کی نسبت کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے

---

[1] روض الانف (سُہیلی)، جلد اوّل ص ۱۰۵

[2] روض الانف (سُہیلی) جلد اوّل ص ۱۰۵

[3] تاریخِ کامل ابن الاثیر جلد اوّل ص ۱٦۲

بیت اللہ کو امن و سلامتی کے پُر عظمت مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اولادِ اسماعیل نے اجتماعی طور پر اس کے تقدس کی حفاظت کی۔ آگے چل کر قصّی بن کلاب نے ملکِ عرب میں اس کی سیاسی مرکزیت کو قائم رکھا۔ ابرہہ چاہتا تھا کہ اللہ کی حکمرانی کے اس مرکزی مقام کو منہدم کر دیا جائے۔ لیکن اللہ نے اس پر حملہ کرنے والوں کو بساطِ عالم سے مٹا دیا۔

جب عالمِ انسانیت کے مذہبی مرکز میں یہ واقعہ ایک بہت بڑے سیاسی واقعہ کی حیثیت سے رُونما ہو چکا تو اسی مقام پر اسی سال اس شخصیت کا ظہور ہوا جس کی جدوجہد میں مستقبل کی تمام دُنیا کا امن وابستہ تھا۔ تاریخ میں اسے عام الفیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ قدرتِ خداوندی کی کرشمہ سازیاں دیکھیے کہ فارس کی سرزمین پر اس سال نوشیروان عادل حکمران تھا اور یہ نوشیروان کا بیالیسواں سالِ جلوس تھا۔ صحیح ترین روایات کے مطابق آنحضرتؐ کی ولادتِ باسعادت دوشنبہ کے روز ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی۔ کتبِ تاریخ میں مقامِ ولادت دار ابو یوسف کے نام سے معروف ہے[1]۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ یومِ اوّل سے یومِ آخر تک بے شمار سیاسی واقعات کا حسین ترین مرقع ہے۔ آپ کی ولادت سے پہلے اور ولادت کے وقت اگر اس دور کے مشاہیر مذہبی رہنماؤں کا یہ خیال تھا کہ عبدالمطلب کے گھر میں اقوامِ عالم کا سردار پیدا ہوگا تو پیدائش کے بعد اس خیال نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور جو کچھ وہ سُنتے یا کہتے آئے تھے، وہ باتیں واقعاتی صورت میں دُنیا کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں۔

بہت سے ممتاز و مشہور مصنفوں نے آنحضرتؐ کی سیرت نگاری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جن میں علامہ سہیلی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ حضرت آمنہ اپنے اس فرزندِ عالی مرتبت کی ولادت سے پہلے ہی آنے والے واقعات کی روشنی کی

---

[1] تاریخ الامم والملوک طبری جلد ۲ صفحہ ۱۲۷

ایک جھلک دیکھ چکی تھیں۔ یہ روشنی کیا تھی جو آئندہ رونما ہونے والے واقعات کے پردے میں مستور تھی؟ یہ تھی آنے والے دور کی حکومت اور مستقبل کی فتوحات کا ابتدائی نظارہ[۱]۔

رسول اکرمؐ اللہ کے آخری نبی تھے، سلسلۂ نبوت آپ کی دنیا میں تشریف آوری پر ختم ہوگیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ اس عالمِ رنگ و بو کی حکومت کے کاموں اور کارناموں میں ایک انتہائی بالادست حکومت کے نائب کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپؐ نے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ حکومت اور مذہب کے امتزاج ہی سے دنیا میں معتدل و متوازن نظام قائم ہوسکتا ہے اور انسانی معاشرہ کو راہِ مستقیم پر گامزن کرنے کا اصل ذریعہ یہی ہے۔ حکومت کا مطمحِ نظر خدمتِ مذہب ہونا چاہیے اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وسائلِ حکومت کو بروئے کار لانا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ رسول اکرمؐ کا عہدِ مبارک سیاسی فرائض و تصورات کی انجام دہی کے لحاظ سے بھی اتنا ہی بے مثال تھا جتنا کہ نبی آخر الزمان کی حیثیت سے عدیم النظیر بلکہ کہنا چاہیے کہ سراسر اعجاز تھا۔

بارہ سال کی عمر میں آنحضرتؐ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارت کی غرض سے ملکِ شام کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ بُصریٰ کے قریب پہنچتے ہیں تو ایک عیسائی راہب سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام بَحیرا ہے۔ وہ آپؐ کو دیکھتا ہے تو اسے آپؐ کی شخصیت میں ایسے جوہر نظر آتے ہیں جو دوسرے کسی شخص میں پائے نہیں جاتے۔ وہ اس پر نہایت تعجب کا اظہار کرتا ہے اور آپ کے دستِ مبارک کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا ہے:

هٰذا سید العالمین، هٰذا رسول رب العالمین، یبعثه الله رحمة للعالمین[۲]

---

[۱] روض الانف جلد اوّل ص ۱۱۱، ۱۱۲

[۲] سیرت ابن ہشام جلد اوّل ص ۱۱۹

یعنی یہ شخص تمام دُنیا کا سردار ہے، اسے تمام دُنیا کے رب کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے، اس کو اللہ نے کل عالم کے لیے باعثِ رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔

یہاں سردار (یعنی سید) کے معنی سیاسی اعتبار سے سردار کے بھی ہیں اور نبی آخرالزماںؐ اور اللہ کے فرستادہ اور دین اسلام کے داعی اور پیغمبر کے بھی ہیں۔ بحیرا راہب نے اہلِ قافلہ کو خاص طور سے ہدایت کی کہ اس بچے کو جس کا مستقبل درخشاں ہے سلطنت روم کی طرف نہ لے جانا، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اسے قتل کر دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے تو دُنیا بھر کی حکومت وسیادت کی باگ ڈور ہاتھ میں لینا اور لوگوں کو دینی وسیاسی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا ہے، اسے ہر قسم کے متوقع خطرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد اسامہ کی فوجی مہم اسی علاقہ روم کی طرف روانہ کی گئی اور یہ وہ مہم تھی جو خود رسُول اکرمؐ نے بھیجنے کا قصد فرمایا تھا، مگر آپؐ کی رحلت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اور پھر آپؐ کے اس عزم کی تکمیل خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کی۔ (باقی)

تصحیح

پروفیسر محمد سلیم صاحب کے مضمون "احیاءِ اسلام اور نفاذِ شریعت" میں حسب ذیل اغلاط کی تصحیح کر لیں۔ ص ۲۱۹ — ۱۸۵۷ء کے بجائے جنگ پلاسی کا سال ۱۷۵۷ء ہے۔ "کارن واس" کی جگہ "کارن والس" پڑھیں۔ ص ۲۲۱ خطبۂ صدارت "محمد علی جوہر" کے بجائے "محمد علی جناح" ہونا چاہیے۔ ص ۲۲۲ ۱۳ مارچ کے بجائے ۱۲ مارچ پڑھیں۔ (ادارہ)

سیّد مودودیؒ اور دینی طبقات

حافظ محمد ادریس صاحب۔ منصورہ، لاہور

سیّد مودودیؒ کو اس صدی کے بے شمار لوگوں نے دیکھا۔ بعض نے بہت قریب سے اور بعض نے کچھ فاصلے سے۔ بعض نے اُن کو شخصی طور پر دیکھا ہے اور بعض نے انہیں لٹریچر کے آئینے میں۔ بے شمار لوگوں کو سیّد مرحوم سے منفی پروپیگنڈے کے نتیجے میں تعارف حاصل ہوا۔ ان ان گنت انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو من گھڑت، بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کے تاروپود سے بُنے گئے جال سے باہر نہ نکل سکے۔ جب کہ ایک خاصی تعداد ان خوش قسمت انسانوں کی بھی ہے جن کا ابتدائی تعارف تو منفی قوتوں کے ذریعے ہوا۔ مگر حقیقت تک پہنچنے کی خواہش نے انہیں توہمات کے جزیروں میں مقید رہنے کے بجائے صداقت کے بحرِ ذخار میں خود اتر کر غوطہ زن ہونے کا حوصلہ بخشا۔ مجھے سیّد مودودیؒ کے بدترین مخالفوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اور ان کے جان نثار عقیدت مندوں سے بھی رابطہ رہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے معاندین تقریباً بلا استثناء ان کی فکر اور لٹریچر سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انہیں اپنے قائم کردہ تصورات کے حق ہونے کا زعم تو ہے، مگر یقین ہرگز نہیں۔ ان سے جب بھی کہا جائے کہ سیّد مودودیؒ کی فکر اور شخصیت کو سمجھنا ہو تو ان کی تحریروں کا مطالعہ کرو تو جواب میں عموماً سُنا جاتا ہے کہ نہیں جی! اس کی تحریریں بڑی خطرناک اور گمراہ کن ہیں اور ہمارے بزرگوں نے یہی کہا ہے کہ ان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

سید مودودیؒ کی کتابیں تو دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں اور بہت سی کتابیں بشمول تفہیم القرآن مارکیٹ میں دستیاب بھی نہیں ہوتیں - ایڈیشن چھپتا ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے - ظاہر ہے کہ خریدنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوگی - تاہم یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ کتاب خرید تو لیتے ہیں مگر مطالعہ کا حق ادا نہیں کرتے -

کتابوں کے علاوہ سید مودودیؒ سے ملاقات اور براہ راست رابطہ بھی ان کی شخصیت اور افکار سے متعارف ہونے کا ایک ذریعہ ہے - ظاہر ہے کہ سید مودودیؒ تو دنیا میں موجود نہیں، ان سے ملاقات کیسے کی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سید مودودیؒ سے براہ راست روابط اور ملاقاتوں کا شرف حاصل کرنے والے ہزاروں افراد آج بھی دنیا میں موجود ہیں، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات اور تجربات نقل بھی کیے ہیں اور وہ مطبوعہ صورت میں موجود ہیں - سید کے عقیدت مندوں اور مداحوں کی ایک بڑی تعداد سید کی شخصیت کے بارے میں نہایت قیمتی اور ایمان افروز واقعات اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوتے ہے - یادداشتوں کا یہ انمول خزانہ اگر سینہ قرطاس پر منتقل نہ ہوا تو ان لوگوں کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی یہ خزانہ بھی زیر زمین چلا جائے گا - جماعت اسلامی کی پچاس سالہ تقریبات کی مناسبت سے ان تمام لوگوں سے جو لکھنا جانتے ہیں، درخواست ہے کہ یہ امانت آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا اہتمام کریں -

سید مودودیؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مزید بھی لکھا جا رہا ہے - اس مختصر مضمون میں ان کی زندگی کے ایک پہلو کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مقصود ہے -

مولانا مودودیؒ ایک دینی شخصیت تھے وہ عظیم مفکر، مصنف، محقق، مدبر اور مفسر قرآن تھے - دینی حلقوں میں ان کی شخصیت متنازعہ رہی مگر خود ان کا طرز عمل اتنا کھرا، بے داغ اور بے لوث تھا کہ انہوں نے دینی طبقات اور دینی شخصیات کی مخالفت کے باوجود کبھی ان کے خلاف اپنے قلم اور اپنی زبان کو استعمال نہیں کیا - اس کی وجہ

یہ نہیں تھی کہ مولانا مرحوم کے خلاف زبان کھولنے والے تنقید سے بالاتر تھے یا مولانا کے پاس ان کا مقابلہ کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ مولانا چاہتے تو وہ بھی جواب میں ان پر حملہ کر سکتے تھے، مگر مولانا نے ایسا نہیں کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے ان کے مقابلے میں سکوت کیوں اختیار فرمایا؟ بجائے اس کے کہ ہم خود اس کا جواب ڈھونڈیں بہتر ہے کہ ہم مولانا ہی سے پوچھ لیں۔ مجھے اب تک مولانا کی وہ مجلسیں یاد ہیں جن میں اس موضوع پر حاضرین کی طرف سے سوال پوچھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا سے کسی نے کہا۔ "مولانا فلاں عالمِ دین آپ کے خلاف ہر روز کوئی نہ کوئی بیان دیتے ہیں، مگر آپ ان کا کبھی جواب نہیں دیتے"۔ مولانا نے فرمایا "میرے پاس کرنے کے اور بہت سے کام ہیں۔ میں نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے"۔

یہ جواب بہت جامع ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اگر مولانا مودودیؒ ان لوگوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کے جواب میں کوئی کارروائی کرتے تو لادین عناصر کے خلاف آپ کی قابلِ قدر کاوشیں متاثر ہوتیں۔ مولانا نے اپنے قلم، زبان، اوقات اور صلاحیتوں کو بڑی منصوبہ بندی سے ان قوتوں کے خلاف استعمال کیا جو دین، شعائرِ دین اور اہلِ دین کے خلاف ہر وقت سرگرمِ عمل رہتی تھیں۔ اگر مولانا مودودی علماء کی توپوں کو خاموش کرانے کے لیے جوابی فائرنگ کرتے تو یہ دین کی کوئی خدمت نہ ہوتی۔

ایک مرتبہ بہت بڑے عالمِ دین کے بارے میں مولانا کو توجہ دلائی گئی کہ وہ مولانا کے خلاف اپنی مجلسوں میں حتیٰ کہ اپنے دروس تک میں بہت کچھ کہتے ہیں۔ مولانا نے پہلے تو خاموشی اختیار کی، مگر بار بار کے سوالوں کے جواب میں مولانا نے زبان کھولی تو ارشاد فرمایا۔ "مولانا ..... بہت نیک آدمی ہیں، شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے ذخیرۂ حسنات میں میرا کچھ حصہ رکھا ہے۔ میں اُسے کیوں ضائع کروں"؟

تبلیغی جماعت ایک وسیع تنظیم ہے۔ دنیا بھر میں اس کے حلقے بھی قائم ہیں اور ان کے وابستگان متحرک بھی نظر آتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے بارے میں اس کے مخالفین بہت کچھ کہتے ہیں۔ خود تبلیغی جماعت کسی اور کے بارے میں کچھ کہے یا نہ کہے جماعت اسلامی پر یہ لوگ

"خاصہ مہربان" ہیں۔ سید مودودیؒ کے بارے میں ان کا طرزِ عمل کیا ہے؟ اس موضوع پر کئی ایک کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خاص طور پر مولانا علی میاں مدظلہ العالی کے شاگرد اقبال احمد ندوی صاحب کی کتاب "بدلتے نصب العین" قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام کتابوں کا تذکرہ کر دیا ہے جن میں تبلیغی جماعت کے اصحابِ قلم نے مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت پر "نظرِ کرم" فرمائی ہے۔ مولانا مودودیؒ سے ان کی مجلسوں میں تبلیغی جماعت کے بارے میں بہت سے سوال پوچھے جاتے تھے۔ مولانا ہمیشہ ہر سوال کے جواب میں تبلیغی جماعت کے بارے میں اپنی زبان سے کلمۂ خیر ہی ادا فرماتے تھے۔ ان کا جواب ہوتا تھا۔ "تبلیغی جماعت اچھا کام کر رہی ہے اور ان کے اچھے کام میں جہاں تک ہو سکے، تعاون کرنا چاہیے"۔

مولانا مرحوم کے دل میں تبلیغی جماعت کے مؤسس مولانا محمد الیاسؒ کی بڑی عزت تھی۔ جماعتِ اسلامی کے قیام سے قبل مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دعوت پر سید مودودیؒ میوات اور گرد و نواح کے علاقوں میں تشریف لے گئے۔ تبلیغی جماعت کے کام کو قریب سے دیکھا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر ایک مبسوط مقالہ لکھا۔ اس کے ابتدائی حصہ میں مثبت پہلوؤں کا ذکر کیا اور تبلیغی جہود کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ ترجمان القرآن ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے مولانا کے مقالے کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ دوسرا حصہ ترجمان میں شائع کرنے کے بجائے سید صاحب نے غور اور مطالعہ کے لیے مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ مولانا اس کی حکمت یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ مثبت پہلوؤں کی اشاعت و تشہیر سے عامۃ الناس کو تبلیغی جماعت اور اس کے کام سے متعارف کرانے کا فائدہ ہے جب کہ منفی پہلوؤں کی اصلاح کے لیے جماعت کے ذمہ داران کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تشہیر سے فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال زیادہ ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مرحوم نے "فتنۂ مودودیت" لکھی تو تبلیغی جماعت کے حلقوں پر اس کا بڑا چرچا ہوا۔ تبلیغی بھائیوں نے اسے خوب پھیلایا۔ جب سید مودودیؒ کو اس کے بارے میں بتایا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں ایک مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ

کہا " اچھا مولانا زکریا صاحب نے اس عنوان سے جو کتاب لکھی ہے وہ آپ نے پڑھ لی ہے؟" مجلس میں پھر خاموشی چھا گئی - ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ اس کا جواب آنا چاہیے - مولانا نے پھر اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا " نہیں جواب کی کیا ضرورت ہے - یہ کتاب خود اپنا جواب آپ ہے " گویا مولانا یہ کتاب دیکھ چکے تھے - میں نے اس وقت تک یہ کتاب نہیں دیکھی تھی - مولانا کا جواب سُن کر مجھے تعجب ہوا - مگر سچ پوچھیے تو یہ کتاب پڑھتے ہوئے قاری تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اور اس کا ذہن مسموم نہ ہو تو محسوس کر سکتا ہے کہ کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی تھی اُسے حاصل کرنے سے یکسر قاصر ہے -

مولانا مودودیؒ کے علم پر ان کا حلم غالب تھا - اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں علماء کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے مالا مال ہوتے ہیں (فاطر آیت ۲۸) — مولانا مودودیؒ جو لادین عناصر کے مقابلے میں ننگی تلوار تھے - دینی عناصر کے مقابلے میں بڑے تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتے تھے - وہ فرمایا کرتے تھے " اِس مُلک میں دیندار طبقات کی پہلے ہی کون سی عزت باقی رہ گئی ہے کہ ان پر حملے کر کے رہی سہی کسر بھی نکال دی جائے " ایک مرتبہ ارشاد فرمایا " لادین عناصر کی یہ بڑی خواہش ہے کہ علماء آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں - بدقسمتی سے بعض علماء اپنی سادہ لوحی یا کسی اور وجہ سے اس میدانِ جنگ میں اُتر چکے ہیں - مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دین دشمنوں کے اس منصوبے میں ہرگز فریق نہیں بنوں گا "

جب مولانا مودودیؒ پر ہر جانب سے حملے ہو رہے تھے اور اتہامات کا بازار گرم گرم تھا تو کئی " بزرجمہروں " نے خبر دار کیا کہ مولانا مودودیؒ اب کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں - ان کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے، " میں نے ان لوگوں کو سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اپنے اللہ سے کوئی دعویٰ کیے بغیر جا ملوں گا - اور پھر اس سے درخواست کروں گا کہ وہ ان لوگوں سے ان الزامات کی بازپرس کرے "

معاندین میں سے ایک بزرگ نے گوہر افشانی کی کہ سید مودودی عنقریب نبوت کا

یا کم از کم مہدی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھیں گے۔ سیّد مودودیؒ نے اس الزام کے جواب میں نہایت ہلکے پھلکے انداز میں فرمایا: "میں تو جو دعویٰ کروں گا سو کروں گا۔ مگر ان صاحب نے تو مستقبل کے بارے میں علم غیب کی خبر دے کر خدائی کا دعویٰ کر بھی دیا ہے"۔

اِن سارے واقعات میں آپ نے دیکھا کہ ایک جانب سے مسلسل زیادتی کی جارہی تھی، اور دوسری جانب سے تحمل و بردباری، حلم و درگذر اور عفو و صبر کا نمونہ پیش کیا جارہا تھا۔ مولانا مودودیؒ کی علماء کے ایک گروہ نے مخالفت کی تو اس میں بھی شک نہیں کہ ایک بڑی تعداد نے ان کی کاوشوں کو قدر و تحسین کی نظر سے دیکھا۔ مولانا کے مداحوں میں ہر مکتب فکر کے علماء کرام شامل تھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد چراغؒ، مفتی سیاح الدینؒ کاکاخیل، مولانا ابوالبرکاتؒ، مولانا ابوالحسناتؒ، مفتی محمد حسنؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا عبدالستار دہلوی، مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ العالی اور بہت سے دیگر جید علماء سیّد مودودیؒ کے قدردان تھے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر اہلِ قلم نے کسی حد تک کچھ لکھا ہے۔ مختلف لوگوں کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ علمائے حق نے مولانا مودودی کے بارے میں کیا کچھ کہا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب چیزیں خاصی اہم ہیں اور جن لوگوں کو اس بارے میں معلومات ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ ان کو تاریخ کے سپرد کر دیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحبِ عزیمت تھے۔ انہوں نے اس عزیمت کا مظاہرہ بدترین آمروں کے ظلم و جور کے سامنے اپنی بے پناہ استقامت سے کیا اور اپنے معاصرین کے ساتھ ان کی جفاؤں کے مقابلے میں عفو و درگذر اور خوئے دلنوازی کا معاملہ فرما کر اس میدان میں کمال حاصل کیا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: "اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳]۔ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے[۶۵]، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے[۶۶]، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۶۷]۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں، ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور

درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔[۶۸]" (سورہ شوریٰ آیت ۴۰ تا ۴۳)۔

مفسر مودودیؒ نے ان آیات کی تفسیر میں جو حاشیے لکھے ہیں اس مضمون کا اختتام انہی پر کیا جا رہا ہے۔ قارئین کرام دیکھیں گے کہ صاحبِ تفہیم القرآن نے اپنے قلمِ معجز بیان سے جو کچھ کاغذ کے سینے پر الفاظ کی صورت میں منتقل کیا ہے وہی کچھ دھرتی کے سینے پر اپنے اعمال سے نقش فرمایا ہے:

بقول اقبال

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

تو ملاحظہ فرمائیے تفسیری حاشیہ جات!

[۶۳] یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جباروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ ان کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے، جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

[۶۴] یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ ماسبق کی تشریح کے طور پر ہے۔

[۶۵] یہ پہلا اصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی بُرائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی بُرائی وہ اس کے ساتھ

کرے، اُس سے زیادہ بُرائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

۶۴ یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لینا، اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہے، وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

۶۵ اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک بُرائی کے بارے میں اس سے بڑھ کر بُرائی کر گزرنا جائز نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینہ انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بہن یا بیٹی سے زنا کرے۔

۶۶ واضح رہے کہ ان آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دُنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمہارے ہی معاشرے کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم ص ۵۱۱ - ۵۱۲)

تحریکِ اسلامی کے اخلاقی تقاضے

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

رشتہ و ناطہ ہر اسلامی تحریک نے ہمیشہ انہی چیزوں کی قربانی کا بار بار مطالبہ کیا ہے اور انہیں داؤں پر لگائے بغیر کوئی تحریک نشوونما نہیں پا سکتی۔ اسی رشتہ و ناطہ کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۃ المجادلہ کی آیت ۲۲ میں فرمایا گیا ہے:

ترجمہ (تو یہ کبھی نہ دیکھے گا کہ وہ لوگ جو اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں، وہ ایسے لوگوں سے دوستی کریں جو اللہ اور رسول کے مخالف ہیں چاہے وہ ان کے اپنے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی یا قریبی عزیز، ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان اُتر گیا ہے اور غیب سے ان کی مدد کی گئی ہے، اللہ انہیں ایسے مقام میں داخل کرے گا جس میں نہریں بہتی ہیں یہ ہی اللہ کا گروہ ہے اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔")

دنیا کی کامیاب ترین اسلامی تحریک کے سامنے جب رشتہ و ناطہ کی قربانی کا مسئلہ آیا تو اس نے معرکۂ بدر میں اس کا حیرت انگیز نمونہ پیش کیا۔ وہ معرکہ برپا کر کے اس نے ساری دنیا کے سامنے اپنے اللہ کا گروہ ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں لکھا ہے:

"ان کے اپنے بھائی بند سامنے تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا،

کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلواروں کی زد میں آ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش میں صرف وہی لوگ پورے اُتر سکتے تھے جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہوا تھا اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے منقطع کرنے پر تل گئے تھے"۔

جنگ قادسیہ میں مشہور صحابیہ خنساءؓ اپنے چاروں بیٹوں سمیت شریک ہوئیں اپنے لڑکوں کو لڑائی میں شرکت پر خود اُبھارا اور انہیں شہادت کا شوق دلایا۔ چنانچہ وہ چاروں لڑائی میں گئے اور شہید ہو گئے۔ جب ماں کو اس کے بیٹوں کی شہادت کی خبر دی گئی تو ماں نے بیٹوں کی شہادت پر کہا، اللہ کا شکر ہے کہ جس نے اُن کی شہادت سے مجھے شرف بخشا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ اُن کی رحمت کے سایہ میں ان چاروں کے ساتھ میں بھی ہوں گی"۔

سید احمد شہید کی تحریکِ مجاہدین کو ہزاروں کوس دُور پردیس میں جا کر راہِ حق میں جان دینے سے کوئی رشتہ و ناطہ نہ روک سکا۔ رشتے اور ناطے تو وہ عارضی تعلقات ہیں، جو دُنیا کی چار روزہ زندگی میں واقعۂ پیدائش سے وجود میں آتے ہیں اور جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو ختم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی تعلق تو وہی ہے جو اللہ اور رسول پائیدار تعلق کے طور پر قائم رہنے دیں۔

مال و دولت مال و دولت بھی بلا شبہ راہ حق کے رشتے کا بہت بڑا پتھر ہے۔ یہ انسان کو سہولت پسند، آرام طلب، خواہشات کا بندہ اور بوجھل بنا دیتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اس مال و دولت کو دائیں اور بائیں یوں اور یوں صرف کرو تاکہ وہ حق دار کو پہنچے اور سمٹنے کے بجائے معاشرے میں پھیل جائے۔ اس لیے خدا اور رسولؐ کی طرف سے انفاق کا بار بار حکم دیا گیا ہے تاکہ اس کی محبت دل سے نکلے۔ چنانچہ جب لوگوں نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں تو اللہ تعالےٰ نے انہیں خود جواب دیا۔

فرمایا۔" ترجمہ (آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے جو ضرورت سے

زائد ہو۔" گویا اللہ کی راہ میں اسلامی تحریک کی خاطر خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کیا جائے اور ضرورت کا تعین انسانی بنیادی ضروریات کو سامنے رکھ کر اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے قلبی لگاؤ کا پیمانہ بنا کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ خود ایک بہت بڑا مظہر تقویٰ ہے اور طہارتِ نفس کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ بھی صدقہ ہی ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ درحقیقت قرآن کے اپنے الفاظ میں اللہ کو قرض دینے کے مترادف ہے۔

فرمایا گیا: ترجمہ "تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض دے"

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے اور پھر اسے گن گن کر اور سمیٹ سمیٹ کر رکھنے اور پھر اس کے اپنے پاس ہمیشہ رہنے کا یقین رکھنے کے خیال کو ذریعہ ہلاکت قرار دیا ہے، کتنی سچی حقیقت بیان فرمائی تھی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے جب وہ اپنے حواریوں سے یوں مخاطب ہوتے تھے۔

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز سمجھے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو۔ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت

کے ان میں سے کسی کے مانند پہنتا نہ تھا۔ پس جب خدا میدان میں گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقاد تم کو کیوں نہیں پہنائے گا۔ اس لیے فکرمند نہ ہو کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ کل کے لیے فکر نہ کرو۔ کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج کا دکھ کافی ہے۔"

معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے لیے قدم تیز تر رکھنا مشکل ہوتا ہے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے رہیں اور جب تک انہیں تحفظِ جان و مال کی مؤثر ضمانتیں نہ مل جائیں، ان کے لیے قدم اٹھانا اور آگے بڑھنا دوبھر ہو جاتے۔ انقلابی کام تو ہمیشہ انہی لوگوں نے سرانجام دیے ہیں جو سر ہتھیلی پہ لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہر بازی کھیل جائیں۔ ایسے ہی لوگ اللہ کا کلمہ بلند کر سکتے ہیں۔

اس میدان میں حضورؐ اکرم کی برپا کردہ اسلامی تحریک کے کارکنوں نے حیرت ناک قربانیاں دیں اور ثابت کیا کہ وہ مال و دولت ان کے لیے واقعی ہاتھوں کے میل اور راستے کی گرد کے مانند تھا۔ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کے سانچے میں پورے پورے ڈھلے ہوئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اس معاملے میں کیا ہدایات ہیں۔

فرمایا گیا

ترجمہ "دردناک خوشخبری سنا دو ان لوگوں کے لیے جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی ہی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔"

(توبہ — ۳۵)

حضور اکرمؐ نے فرمایا اور حضرت اسماءؓ نے بیان کیا کہ:

"حضورؐ نے مجھ سے فرمایا خرچ کیا کرو اور شمار نہ کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے اور بند نہ رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر بند رکھے حسبِ استطاعت خرچ کیا کرو۔" متفق علیہ

"یارسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے" ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔

"دیکھ کیا کہتا ہے" حضورؐ نے تنبیہہً ارشاد فرمایا۔

انہوں نے پھر دُہرایا اور حضورؐ نے بھی یہی جواب دیا۔ تین بار دہرانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"اچھا تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کے اوڑھنے بچھونے کے لیے تیار ہو جاؤ اس لیے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے دوڑتا ہے جیسے پانی ڈھلوان کی طرف آتا ہے۔"

جب رُومیوں کے حملے کی خبر مدینہ پہنچی اور حضورؐ نے مقابلے کا فیصلہ فرمایا تو فوجی تیاری کے لیے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر مالی ایثار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے تجارتی قافلے کے دوسو اُونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے اور مزید دوسو قنطار سونا اسلامی تحریک کو دیا۔ چنانچہ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "آج کے دن کے بعد **عثمان** خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایسا ہی نقشہ ہمیں تحریک میں جاہدین سے وابستہ لوگوں میں نظر آتا ہے۔ لوگوں نے تحریک کے لیے جائیدادیں ضبط کرائیں اور جائیدادیں فروخت کر کر کے تحریک کو تقویت پہنچائی اور سب کچھ بیچ کر تحریک کے قافلۂ جہاد میں فقیر بن کر شریک ہو گئے۔

(باقی)

محترم صدرِ مملکت کے نام کھلا خط

جناب ڈاکٹر وسیم اختر صاحب

محترمی و مکرمی جناب غلام اسحٰق صاحب صدر مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جناب عالی!

میں آپ کی خدمت میں چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

میں نے بیس سال امریکہ میں رہ کر اس کے معاشرہ اور مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ "اعلیٰ تعلیم" حاصل کرنے کے بعد اپنے بچوں کی خاطر ان کو اسلامی تہذیب کی اقدار سے روشناس کراتے اور ایک بہتر ماحول کی تلاش میں امریکہ کی تمام آسائشوں اور مالی منفعت سے بھرپور ملازمت چھوڑ کر چار سال سے پاکستان میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا ہوں۔ خیال تھا کہ اس طرح میں اپنے بچوں کو مغربی تہذیب کے بیمار پہلوؤں سے جس کا پرچار وہاں پر ابلاغ عامہ (MASS MEDIA) یعنی ریڈیو، ٹی وی اور رسالوں وغیرہ کے ذریعے سے بھرپور انداز سے کیا جاتا ہے، بچا سکوں گا۔ مگر تعجب اور افسوس میں نے پاکستان آکر تقریباً وہی کچھ پایا اور دیکھا جس سے بچ کر میں امریکہ سے بھاگا تھا۔

آپ کے اور دوسرے اربابِ اقتدار اور اصحابِ اختیار حضرات کی خواہشات و خیالات اکثر و بیشتر اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں جس

میں بچوں میں اسلامی اقدار پیدا کرنے، انہیں نیک اور صالح شہری بنانے کی ضرورت پر بہت زور دیا جاتا ہے مگر افسوس عملی طور پر کوئی قدم ابھی تک نہیں اٹھایا گیا، بلکہ اس کے برخلاف بچوں میں رہی سہی اسلامی اور مشرقی اقدار ختم کرنے کا عملی مظاہرہ ہو رہا ہے۔ میرا اشارہ ایک سال سے زائد عرصے سے شروع ہونے والی CNN اور PTN کی نشریات کی طرف ہے جس کے متعلق اخبارات میں لوگوں کے احتجاج اکثر و بیشتر سامنے آتے رہتے ہیں۔

ہماری اسلامی اور عوامی حکومت نے چوبیس گھنٹے مسلسل CNN اور PTN کی نشریات (درآمد شدہ مغربی ڈرامے، فلمیں، انٹرویوز، یک طرفہ تعصب زدہ خبروں وغیرہ) کے ذریعے سے اسلامی اقدار کی پامالی اور مغربی تہذیب کے بیمار پہلوؤں کے زہر کو موجودہ اور آنے والی نسلوں میں سرایت کرنے کا جو نظام ہمارے پر مسلط کیا ہے اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ بجائے اس کے کہ پچھلی حکومت جس کو آپ نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو برطرف کیا تھا اس کی اس کارروائی کو ختم کیا جاتا، مزید بڑے شہروں میں پھیلایا جا رہا ہے۔ مثلاً ابھی حال میں لاہور میں بھی یہ نشریات شروع ہو گئی ہیں۔ اور تیسرے چینل کو بھی درآمد کرنے کی زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔

آخر یہ تضاد کیوں ؟؟

ایک طرف حکومت کی طرف سے اسلامی اقدار قائم کرنے کی لمبی چوڑی باتیں کی جاتی ہیں۔ پروگرام بنائے جاتے ہیں، کمیٹیاں اور کمیشن قائم کیے جاتے ہیں، شریعت بل پاس کیے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف ابلاغ عامہ خاص طور سے T.V کی نشریات کے ذریعے سے درآمد شدہ واہیات اور خرافات، مار دھاڑ سے بھرپور، غیر اخلاقی اور غیر اسلامی پروگرام براہ راست نشر کیے جا رہے ہیں جن کو خود مغرب میں وہاں کے ذی شعور دانشور اور سمجھدار طبقہ دیکھنا اور اپنے بچوں کو دکھانا پسند نہیں کرتا۔ مثلاً حال ہی میں امریکی اٹارنی جنرل ایڈون میز (EDWIN MEESE) نے ۱۱ ممبران کے "کمیشن برائے فحاشی" کی تیار کردہ رپورٹ میں جنسی تشدد، مار دھاڑ،

اخلاق سوز واقعات، قتل و غارت گری کے موضوع پر تیار کیے جانے والے پروگراموں مثلاً فلمیں، ڈرامے وغیرہ اور رسالے جن کی تشہیر بڑے پیمانے پر ابلاغ عامہ کے ذریعہ مغرب میں کی جاتی ہے نئی نسل کی اقدار پر پڑنے والے ان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔
اس کے علاوہ پچھلے ماہ نیوٹن مینو (NEWTON MINO) جو ۳۰ سال پہلے صدر کینیڈی کے زمانے میں "فیڈرل کمیونیکیشن کمیشن" کے چیرمین رہ چکے ہیں اور حال ہی میں امریکہ کے مشہور T.V اسٹیشن سی بی ایس کے آٹھ سال ڈائریکٹر رہ کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ امریکی T.V پر تقریر کرتے ہوئے اسے VAST WASTE LAND "وسیع بے کار و گندی زمین" سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"میں ۱۹۶۱ء میں پریشان ہوا کرتا تھا کہ میرے بچے امریکی T.V سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور اب ۱۹۹۱ء میں مجھے یہ پریشانی لاحق ہو گئی ہے کہ میرے بچوں کی اولادیں اس T.V سے کتنا نقصان اٹھا رہی ہیں" مینو صاحب نے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے بتایا کہ "امریکہ میں جب بچہ ۱۸ سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ امریکی T.V پر تقریباً ۲۵ ہزار مرتبہ قتل و غارت، زنا بالجبر کے مناظر دیکھ لیتا ہے"۔

یہ تھے مغرب کے معروف دانشوروں کے خیالات اپنے ابلاغ عامہ کے بارے میں۔ مجھے ان مغرب کے دانشوروں کا حوالہ دینے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمارے معاشرے میں با اختیار مغرب زدہ حضرات نے ان کے اقوال ہمیں اپنے اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات سے زیادہ معتبر باور کرائے ہیں۔
مغرب کی اس "وسیع بے کار و گندی زمین" کو ہماری اسلامی حکومت نے ہمارے نوجوانوں پر "بہت کچھ" سیکھنے کے لیے مسلط کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے با اختیار دانشوران اس "وسیع گندگی" کے نوجوانوں پر اثر انداز ہونے کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے ہوں مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمارا ملک جو ترقی پذیر ہے اور کھربوں روپوں کا قرضدار ہے۔ ایک سے زائد T.V. CHANNEL اور وہ بھی درآمد شدہ رکھنے کا کس

طرح متحمل ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بجلی کی کتنی کمی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آئے دن کی لوڈ شیڈنگ اس بات کی گواہ ہے۔ ہماری یہ توانائی ہماری ان صنعتوں کے لیے کتنی اہم ہے جو آئے دن لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ناکارہ ہوئی جا رہی ہیں۔ اور ادھر خود بجا طور پر ہماری حکومت "توانائی بچاؤ"، "بجلی کم خرچ کرو" جیسے اعلانات کرتی رہتی ہے، مگر دوسری طرف ہماری حکومت ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر سالانہ (جنگ اخبار کی خبر) زرمبادلہ سے خریدی ہوئی اس مغرب کی "وسیع گندگی" کو ٹی۔وی پر دکھا کر عوام کو چوبیس گھنٹے بجلی ضائع کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔

ایک طرف ہماری حکومت "خود کفالت"، "سادگی اپناؤ" جیسے بڑے بڑے نعرے بلند کر رہی ہے اور دوسری طرف مغرب کی "وسیع گندگی" کے ذریعے آرائش وجدید فیشن سے بھرپور لباس، گھر وغیرہ دکھا کر ہمارے غریب عوام کو نہ صرف احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہی ہے، بلکہ انہیں ایسی اشیاء خریدنے پر اکسا رہی ہے جو وہ خود انہیں نہیں دے سکتی۔ اس طرح انہیں پرتعیش غیر ملکی مصنوعات (CONSUMERS) کا صارف بنانے کی کوشش کر رہی ہے اور نفسیاتی طور سے مشرقی اور اسلامی تہذیب اور معیار زندگی سے رفتہ رفتہ اکتاہٹ اور نفرت پیدا کرنے کی شعوری اور غیر شعوری کوشش کر رہی ہے۔

آخر یہ سب کیوں؟؟ یہ تضاد کس لیے؟؟ یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کس کے اشارے پر کیا جا رہا ہے؟ میں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی ہونے کے ناطے آپ سے اور اپنی حکومت سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کس طرح سے اپنے بچوں میں اسلامی اقدار پیدا کریں اور جو کچھ ہم والدین اسلامی اقدار اپنی اولاد میں اپنی ذاتی کاوشوں سے پیدا کرتے ہیں کس طرح انہیں قائم رکھنے کی کوشش کریں جب کہ ہماری اسلامی حکومت ان اسلامی اقدار کو چھیننے کی اور ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اب میں آپ کی توجہ اپنے تعلیمی نظام کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، چونکہ یہ بھی

اسلامی اقدار کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس نظام کی فرسودگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ہماری سابقہ حکومتیں اور موجودہ حکومت کئی کمیشن بٹھا چکی ہے مگر افسوس کہ وہ اب تک لارڈ میکالے کے ۱۸۳۵ء کے فرسودہ تعلیمی نظام میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے، بلکہ اسے نت نئے روپ دے کر مزید مستحکم کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے تعلیمی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا مظاہرہ خاص طور سے ہمارے بڑے بڑے شہروں میں کافی ہو رہا ہے۔ حکومت کے زیرسایہ چلنے والے پبلک اور کرسچن سینٹس (SAINTS) کے ناموں سے نام نہاد انگریزی میڈیم پرائیویٹ اسکولوں کی ناکامی کا حشر سامنے ہے۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ کرسچن گرجا گھروں کی نگرانی میں پادریوں اور ننوں کے ذریعے چلنے والے اسکولوں میں ہمارے "مسلمان" والدین اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے نہ صرف بڑی بڑی فیسیں ادا کرتے ہیں بلکہ داخلہ لیتے وقت بھی بڑے بڑے عطیات (DONATIONS) گرجا گھروں اور عیسائیت کے فروغ کے لیے دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

تعلیمی نظام کی ناکامی کو تسلیم کرتے ہوئے ہماری موجودہ حکومت نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ پاکستان میں پرائمری تعلیمی نظام کو ٹھیک کرنے کا ٹھیکہ بھی ورلڈ بینک کے قرض پر نام نہاد "امریکی ماہرین" کو دے دیا گیا ہے یا دیا جا رہا ہے (جنگ اخبار اور ڈان کی خبر)، گویا ہماری حکومت یہ تسلیم کر چکی ہے کہ چالیس سال میں ہمارے تعلیمی نظام اتنے بھی ماہرین پیدا نہیں کر سکے جو یہ کام خود کر سکتے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ ماہرین اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پر خود پرائمری اور سیکنڈری تعلیمی نظام مکمل طور سے ناکام ہو چکا ہے۔ میں خود اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں اپنے امریکی تجربے سے یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح سے لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام نے مغرب کے دلدادہ "بابو" اور "کلرک" پیدا کیے تھے، اسی طرح ان ماہرین کا قائم کردہ نظام انہی جیسی شخصیتیں پیدا کرے گا۔ مغربی صنعتوں کی مصنوعات بیچنے والے انگریزی بولنے سیلزمین اور مینیجر تو پیدا ہو جائیں گے، مگر ایسے مسلمان متقی ماہرین ہر شعبے کے لیے پیدا

نہیں ہو سکیں گے، جن کی ہمارے ملک کو اشد ضرورت ہے۔

تعلیمی نظام کی ناکامی کو تسلیم کرنے کا حکومت کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ حال ہی میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کو اپنے تعلیمی نظام اور امتحانات پاکستانی اسکولوں میں برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (ڈان کی خبر) اس طرح سے پرائیویٹائزیشن (PRIVATISATION) کے نام سے ہمارے بچوں کے مقدر سے کھیلنے اور تجارت کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ جس کے تحت منہ مانگی بڑی بڑی فیسوں کی تو الگ کہانی ہے، سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابلِ افسوس حقیقت اُن کے وہ نصاب ہیں جو درآمد شدہ ہیں اور غیر متعلق ہیں۔ وہ پاکستانی، اسلامی اور مشرقی اقدار کی نہ صرف نفی کرتے ہیں، بلکہ بچوں کو ایسے مواد فراہم کرتے ہیں جو ان کے ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لیے بھی سمِ قاتل ہیں۔ میں آپ کو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس OXFORD UNIVERSITY PRESS کی تیار کردہ TERRY JENRINGS کی پرائمری اسکول کی کتاب "THE YOUNG SCIENTIST INVESTIGATORS BOOK 2" کے صفحہ نمبر ۲۸ سبق "REPRODUCTION IN BIRDS & MAMMALS" کا حوالہ دے رہا ہوں (اور اس کی کاپی منسلک ہے) جہاں پر "HORSE MATING" "گھوڑوں کو صحبت" کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ کتاب کراچی اور پاکستان کے دیگر بڑے شہروں میں نام نہاد انگریزی میڈیم اسکولوں میں مثلاً بیکن ہاؤس گرامر اسکول وغیرہ میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھائی جا رہی ہے۔ تاکہ مسلمان بچوں کو "سائنس دان" بنایا جا سکے۔ کیا میں آپ سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ ہمارے کتنے مسلم اساتذہ ہیں جو کلاسوں میں چھوٹے چھوٹے پرائمری اسکول کے بچوں کو اس تصویر "HORSE MATING" کی وضاحت کر سکیں گے اور کیا طریقہ تدریس استعمال کریں گے؟؟

آخر میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ خدارا کچھ کیجیے۔ اگر آپ اور ہماری حکومت نے اس مغرب کے گندگی کے طوفان کو نہ روکا، تو جس طرح اس گندگی نے خود مغرب میں معاشرتی ڈھانچے کو تباہ و برباد کیا ہے یہاں پر بھی کچھ ہو گا اور ہونے لگا ہے۔ ہمارے

بزرگوں نے اپنی برسہا برس کی کوششوں سے جن اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کام کیا ہے وہ سب نیست و نابود ہو جائیں گی اور ہماری آنے والی نسلیں مکمل طور پر مغرب اور اس کی تہذیب کی غلام ہو جائیں گی۔

اس لیے آپ سے یہی درخواست کروں گا کہ اگر آپ اور ہماری حکومت حقیقی معنوں میں اسلامی اقدار اور اسلامی نظام کا فروغ چاہتے ہیں تو ابلاغِ عامہ اور تعلیمی نظام کو یکسر انقلابی طرز پر تبدیل کریں۔ اس سلسلے میں پہلے اور فوری قدم کے طور پر آپ سے پُرزور استدعا کرتا ہوں کہ CNN اور TNT کی نشریات کو بند کیا جائے اور ان کو خریدنے میں جو زرِ مبادلہ (ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر) خرچ ہو رہا ہے اس کو PTV کے پروگراموں کو بہتر بنانے میں اور مزید تعلیمی اور اخلاقی پروگرام پیش کرنے میں صرف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے تعلیمی نظام کے "دوہرے معیار" یعنی انگریزی اور اُردو میڈیم کی لعنت کو ختم کیا جائے جس کی وجہ سے ہمارے بچوں میں احساس کمتری اور برتری جو ایک ہی بیماری کے دو نام ہیں، پیدا ہو رہے ہیں اور اسی بیماری کی وجہ سے طبقاتی نظام کو مزید تقویت پہنچ رہی ہے۔

تیسرے کہ یہ ہماری حکومت کی پہلی ترجیح اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے غیر ترقیاتی اخراجات کو کم کر کے تعلیم کی اصلاح ہونی چاہیے۔ پرائمری تعلیم خصوصاً ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بجٹ میں زیادہ سے زیادہ رقم مختص کی جائے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہم پرائمری تعلیم کے لیے بھی "ورلڈ بینک" سے "بھیک" اور "قرض" مانگ رہے ہیں جس کی وجہ سے اس بھیک کے ساتھ اُن کے نام نہاد "ماہرین" بھی ہم پر مسلط ہو جائیں گے۔

چوتھے یہ کہ تعلیمی نظام کی "درآمد" بند کی جائے اس لیے کہ آزاد، باوقار، خوددار اور خودمختار قومیں کبھی تعلیم جیسے اہم نظام کو دوسری تہذیب و تمدن سے درآمد نہیں کرتیں، بلکہ خود اپنے قومی نظریات، تشخص اور مقاصد کے حصول کے لیے اپنے تعلیمی نظام کو تشکیل دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔

رسائل و مسائل

"احتکار" کی تعریف کیا ہے؟

سوال: ذخیرہ اندوزی کے متعلق کچھ باتیں حل طلب ہیں۔

ایک مشہور حدیث ہے معلوم نہیں کس کتاب میں درج ہے اور روایتاً کہاں تک درست ہے۔ اور اسلاف کا اس پر کیا کلام ہے۔

من احتکر طعامًا اربعین یومًا یرید به الغلاء فقد بریٔ من الله وبریٔ الله منه۔

اس کے متعلق مقامی علماء فرماتے ہیں کہ یہ قحط کے زمانے سے متعلق ہے۔

میرے اس پر چند اشکال ہیں:

ایک یہ کہ حدیث میں قحط کے لیے کوئی لفظ مذکور نہیں ہے۔

دوم یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ قحط کے زمانے کے لیے ہے، تو چالیس دن کی قید کیوں؟ اس زمانے میں تو ایک دن بھی احتکار کرنا سراسر ظلم ہے۔

تیسرا یہ کہ فرض کیجیے مارکیٹ میں پچاس تاجروں کا غلہ آتا ہے۔ اگر دس دن روکے رکھیں تو قیمت پر اثر نہیں پڑتا؟

واضح ہو کہ ہمارے ہاں چند رفقا، غلہ یا پیاز وغیرہ سستے دام میں خرید کر جمع کر کے رکھتے ہیں۔ تین چار ماہ کے بعد جب قیمت بڑھ جاتی ہے تو مارکیٹ میں لے آتے ہیں۔

براہ کرم! ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ ہمیں شرح صدر حاصل ہو۔ اس مسئلہ پر تفصیلی کلام کی درخواست ہے۔

جواب :- اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ احادیثِ نبویہؐ میں احتکار کی مذمت وارد ہے۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع والمساقات (تحریم الاحتکار فی الاقوات) میں حضرت معمرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من احتکر فھو خاطی، دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: یحتکر الا خاطی (احتکار کا مرتکب خطا کار ہے)۔ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ "اہل لغت کا قول ہے کہ خاطی سے مراد عاصی، آثم، (گناہ گار) ہے اور یہ حدیث احتکار کی حرمت کے بارے میں صریح ہے۔" پھر امام نووی فرماتے ہیں کہ "ہمارے اصحاب یعنی شافعیہ کے نزدیک احتکار سے مراد خاص ذخیرہ اندوزی ہے جو غذائی اجناس واشیاء میں ہو اور اس کی صورت یہ ہے کہ گرانی کے ایام میں بغرض تجارت خریدی جائیں اور پھر انہیں گراں فروشی کی نیت سے روک کر رکھا جائے۔ لیکن کسی نے اپنی زمین سے پیدا کردہ اجناس کا ذخیرہ کر لیا یا ایسے وقت میں خریدا جب گرانی و نایابی تھی مگر اُسے ذاتی ضرورت کے لیے ذخیرہ کیا یا پھر خریدا تاکہ انہی ایام میں بیچ دے تو یہ احتکار نہیں ہے۔"

امام ابن الاثیرؒ نے اپنی لغتِ حدیث، النہایہ میں احتکر کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں: ی اشتراہ وحبسہ یعقل فیغلو (کسی نے اجناس کو خریدا اور پھر اُسے اس غرض سے روک رکھا کہ جنس کمیاب ہو اور گراں، مہنگی ہو)۔

ابن العابدینؒ، ردّ المحتار، الحظر والاباحۃ فصل البیع میں احتکار کی تعریف میں فرماتے ہیں:

الاحتکار لغۃ: احتباس الشیء انتظار لغلائہ (لغت میں احتکار کے معنی کسی شے کو گرانی کے انتظار میں روک کر رکھنا ہے)۔ اگرچہ متن کی عبارت میں احتکار کا اطلاق غذائی اجناس پہ کیا گیا ہے۔ لیکن شرح میں امام ابو یوسفؒ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ کل ما اضر بالعامۃ (احتکار کا اطلاق ہر اس شے کو روک کر رکھنے پہ ہوتا ہے جس کا روک رکھنا عوام الناس کے لیے باعث ضرر ہو)۔

علامہ السید سابق نے فقہ السنۃ جلد ۳ میں احتکار کی مذمت میں متعدد احادیث

نقل فرمائی ہیں: پہلی حدیث وہی ہے جو اُوپر آ چکی ہے۔ یہ مسلم کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی میں بھی وارد ہے۔ مزید احادیث یہ ہیں:

۱۔ من احتکر الطعام اربعین لیلۃ فقد بریٔ من اللہ وبریٔ اللہ منہ (احمد، حاکم، ابن ابی شیبہ) (جس نے چالیس روز خوردنی اشیاء کا احتکار کیا وہ اللہ سے بری اور اللہ اُس سے بیزار ہے۔)

۲۔ بئس العبد المحتکر: ان سمع برخص ساءہ وان سمع بغلاء فرح (جامع رزین) (محتکر بہت بُرا انسان ہے، اگر ارزانی سُنتا ہے تو یہ اطلاع اسے بُری معلوم ہوتی ہے اور اگر گرانی، مہنگائی سُنتا ہے تو خوش ہوتا ہے)۔

۳۔ الجالب مرزوق والمحتکر ملعون (ابن ماجہ، حاکم)
(مناسب قیمت پر فروخت کرنے والے کے رزق کا سامان کیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے)۔

پھر سید سابق لکھتے ہیں کہ احتکار کا اطلاق اس صورت پر ہوتا ہے جس میں اکثر فقہا کے نزدیک تین شرائط پائی جائیں۔

۱۔ ایک شخص اپنی، اپنے اہل وعیال اور زیر کفالت افراد کے لیے سال بھر کی غذائی ضروریات سے زاید کا ذخیرہ کر رکھے۔ کیونکہ سال بھر کے نان ونفقہ کا انتظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

۲۔ زاید از ضرورت اجناس کو گرانی کے انتظار میں روک رکھا جائے تاکہ مال مہنگا بیچا جاسکے۔

۳۔ حالات ایسے ہوں کہ لوگ ذاتی طور پر ضرورت مند و محتاج ہوں، ورنہ اشیاء عام طور پر دستیاب ہوں تو ان کا روکنا، پس انداز کرنا احتکار میں داخل نہیں۔

جن علماء نے قحط کا لفظ استعمال کیا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی مراد وہی گرانی و نایابی ہے جو مصنوعی طور پر تاجروں کے گٹھ جوڑ کر لینے سے پیدا ہوتی ہے اور لغت اور ارشادِ نبویؐ میں جہاں احتکار کا لفظ مستعمل ہے، وہ اسی مفہوم کا حامل ہے۔

وہ قحط سالی جو آفات ارضی و سماوی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ احتکار کو صرف اسی قحط سالی تک محدود و موقوف تو غالباً کسی نے نہ رکھا ہوگا۔

باقی رہ گیا یہ سوال کہ حدیث میں چالیس دن کی قید کیوں ہے؟ اس بارے میں کوئی تشریح و توضیح میری نظر سے نہیں گزری، لیکن میرے ناقص فہم کے مطابق یہاں چالیس کا لفظ مثال و محاورہ کے طور پر استعمال فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد گنتی کے چند ایام ہیں، جس طرح قرآن مجید میں ایاماً معدودہ، دراہم معدودہ، ایاماً معدودات کے الفاظ وارد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جس نے چند روز کے لیے بھی کسی حاجت مند خریدار سے غذائی اجناس کو روکا اور نہ بیچا وہ وعیداتِ مذکورہ کا مستحق ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انسان کے زندہ رہنے اور جسم و جان کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے جس طرح غذا ضروری ہے، اسی طرح بعض ادویہ کا استعمال بھی جان بچانے اور صحت حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے، لہٰذا اشیائے خوردنی کے علاوہ میرے نزدیک ایسی ضروری دواؤں کا روک رکھنا اور چھپانا بھی احتکار کی تعریف میں آتا ہے۔ امام ابویوسفؒ کا قول ردّ المحتار سے اُوپر نقل ہو چکا۔ لابدی ضروریاتِ زندگی کے ماسوا دیگر اشیا (پیاس، کپاس، معدنیات وغیرہ) کی ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی اگرچہ غیر مطلوب و مکروہ ہے، مگر اس پر احتکار کا اطلاق میرے علم و فہم کی حد تک نہ ہوگا۔ اسی طرح غلّہ اگر بازار میں بآسانی دستیاب ہے تو ہر دکاندار یا مالک پر یہ لازم نہیں کہ وہ ضرور مارکیٹ میں اپنا پورا اسٹاک لے آئے، ہاں ذاتی ضرورت یا گھریلو حاجت کے لیے جو گاہک آئے، اُسے انکار نہ کیا جائے۔ قرآن مجید ان لوگوں کی بھی مذمت کرتا ہے جو یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ کے زمرے میں داخل ہیں اور عام اشیائے استعمال کو روک رکھتے ہیں۔ (غلام علی)

مطبوعات

فصلِ زیاں | حفیظ الرحمٰن احسن مدیر انتظامی سیارہ - ناشر: ایوانِ ادب، چوک اُردو بازار، لاہور - ۵۴۰۰۰ تقسیم کنندہ: سدا بہار پبلی کیشنز - ۳، الفضل مارکیٹ ۱۷، اُردو بازار، لاہور - کاغذ، طباعتی معیار، جلد اور گرد پوش قابلِ تعریف -
صفحات: ۱۳۵ - قیمت: -/۴۵ روپے

میں اس کتاب پر کیا لکھوں؟ ایک تو یہ میرے رفیقِ کار کا مجموعۂ غزلیات، دوسرے اس مجموعے پر مَیں پہلے ہی "غزل کی باتوں" کے عنوان سے حفیظ احسن صاحب کی شاعری پر اظہارِ رائے کر چکا ہوں - وہ دل و دماغ کو چھیدتے تیروں کا بے نظیر دَور تھا جس کے احوالِ زار کو بہ پیرایۂ غزل پیش کرنے کا مشکل تجربہ حفیظ احسن صاحب نے کیا - خَلَل کے دلدلی تالاب میں سے غزل کنول بن کر نمودار ہوئی - اس کی شان میں ایک اہم گواہی ملاحظہ ہو:

" مولٰینا ظفر علی خاں کے کمالِ فن اور اکبر الٰہ آبادی کی کاٹ کے دو عظیم دھاروں کے مابین ایک اور آبناے شعر جو اپنے وجود میں مختصر اپنی تندی میں کڑی کمان کا وہ تیر ہے جو فصلِ زیاں کے ترکش ہی سے برآمد ہو سکتا ہے"۔

(فلیپ از اشفاق احمد - داستان سرائے - لاہور)

دوسری بڑی گواہی:

" احسن کے پیرایۂ اظہار کے دو انداز نمایاں ہیں - ایک تو غزل کے روایتی محبوب کا وہ تصوراتی پیکر ہے جو ہماری غزل کا سرمایہ خاص رہا ہے

جس میں عشوہ طرازی، عشاق کشی اور مہر جائی پن کی صفات ایک سیاسی رہنما کی ذات کو ذریعہ اظہار بناتی ہیں۔ دوسرا پیرا تمیمی اور محاکاتی ہے جس میں انہوں نے کھل کر باتیں کی ہیں"۔ (ڈاکٹر وحید قریشی)

اِن باتوں پر کچھ اور اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سلام بحضور خیر الانامؐ جناب حافظ لدھیانوی صاحب۔ ملنے کا پتہ: بیت الادب، ۳۴ جی، راجہ روڈ، گلستان کالونی، فیصل آباد۔ تقسیم فی سبیل اللہ۔ خوبصورت طباعت و کتابت، اچھا کاغذ و سرورق۔ صفحات: ۴۰

نعت کے میدان میں حافظ لدھیانوی کے قلم سرفگندہ کی روانیاں اور حفیظ تائب صاحب کے جذبوں کی، ان کی پیشوائی کے لیے نبیؐ کی وادیِ محبت میں جولانیاں اس کتاب میں یوں آپس میں گھل مل جاتی ہیں جیسے کوثر و تسنیم کی موجیں ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں۔ حافظ صاحب کے سلام کی کیا شان ہے:

ع سلام اُس پر کہ قسمت جس نے بدلی بدنصیبوں کی

ع سلام اُس پر کہ ہے آباد جس سے درد کی بستی

؎ سلام اُس پر کہ جس نے لفظ کو گوہر بنایا ہے
وہ جس کے نقشِ حکمت نے چراغِ فن جلایا ہے

ع سلام اُس پر کہ جس سے عدل کی میزان قائم ہے!

اس سے حافظ صاحب کی محبتِ رسولؐ فن میں سرایت کرنے کا اپنا خاص انداز دکھاتی ہے۔ یہ تو حافظ صاحب کے ذہن رسا اور قلبِ پُر نور کے خاص کرشمے ہیں کہ وہ ایک طرح کے بار بار دہرائے ہوئے مضامین بلکہ الفاظ و اصطلاحات تک کی دنیا میں کھڑے ہو کر نوادر پیش کر دکھاتے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو راستہ نظر نہیں آتا۔

ایک بات البتہ بطور مشورہ! حفیظ جالندھری نے اسی زمین میں پہلا مشہور سلام

لکھا جو مقبول ہوا۔ پھر اسی زمین میں ماہر القادری صاحب نے لکھا۔ وہ بھی اپنا مقام پاگیا اب حافظ صاحب نے اگرچہ بہت طویل سلام لکھ کر کچھ پیش قدمی کی ہے، مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ ذرا بحر کو بدل لیتے۔ فن چاہے نعت ہی کا کیوں نہ ہو، کسی ایک ہی ڈگر پر بار بار گامزنی کرے تو اس میں اکتاہٹ سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بہر حال مدعا اعتراض نہیں ہے۔

رُوحانی لطائف سید منور حسین مشہدی۔ ناشر: مکتبہ سراجِ اسلام۔قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۱۲ سائز $\frac{۲۲}{۸}$×۱۸ غیر مجلد۔ قیمت: ۲۱/- روپے

مادی زندگی میں حقائق کا سامنا کرتے ہوئے مسرت کے چند لمحوں کی تلاش ایک فطری تقاضا ہے۔ اور اچھا لطیفہ یہ موقع فراہم کرتا ہے۔ اِس نقطہ نظر سے ہم اس مجموعۂ لطائف کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ فاضل مرتب نے لطیفوں کے انتخاب میں تہذیب اور شائستگی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ لطیفہ بہت پہلو دار صنفِ ادب ہے۔ بالعموم از خود معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اور اپنی تخلیق کے عمل میں کسی قسم کی قید پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ اسی لیے اس صنف میں کثیفوں کی بہت بھرمار ہے جنہیں سنتے سناتے وقت تہذیب و شرافت مجروح ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک سید منور حسین صاحب نے اچھے لطیفے یک جا کر کے شائستہ مزاج لوگوں پر احسان کیا ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ یہ کتاب خریدی جائے اور اس کے مطالعہ سے مسکرانے کے لیے چند لمحے چن لیے جائیں۔

(ا۔ ز)

جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام   مصنف : ابوالفضل محسن ابراہیم - ترجمہ : اسرار احمد خان

صفحات : ۱۶۴   قیمت درج نہیں -   ناشر : مرکز الدراسات العلمیہ علی گڑھ - انڈیا -

حیاتیاتی مسائل مختلف زمانوں میں مختلف انداز میں سامنے آتے رہے ہیں اور انہیں حل کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں - لیکن موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی پیش رفت کی وجہ سے یہ مسائل گھمبیر صورت اختیار کر گئے ہیں - اِن جدید حیاتیاتی مسائل کو حل کرنے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں جو ایک طرح سے کامیاب نظر آتی ہیں - بانجھ پن کو ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعے وقتی طور پر حل کر لیا گیا ہے ، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر فنی مادریت کے طریقے کو اپنا لیا گیا ہے - ایک طرف اولاد کی اتنی خواہش کہ اس کے لیے جائز و ناجائز ہر طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف انسانی آبادی کے "بم" کو ناکارہ کرکے نسلِ انسانی کو ختم کرنے کے ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں - جس کے لیے ضبطِ تولید ، اتلاف جنین اور اسقاطِ حمل جیسے طریقے روا رکھے گئے ہیں -

آبادی گھٹانے اور بڑھانے کے نئے تکنیکی اور سائنسی طریقوں نے معاشرے میں ایک زلزلہ سا برپا کر دیا ہے - بشری علوم کے ماہرین مختلف انداز میں یہ گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں - جن کا نتیجہ سرگردانی کے سوا کچھ نہیں نکلا -

اسلام معاشرے کے دوسرے مسائل کی طرح حیاتیاتی مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے - کتاب ہٰذا کے مصنف ابوالفضل محسن ابراہیم نے کافی محنت اور کاوش کے بعد ان مسائل پر اسلامی فقہ کی رُو سے بحث کی ہے - بلاشبہ انہوں نے اسلامی موقف کو پیش کرتے ہوئے کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا - لیکن بعض مقامات پر انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے -

کتاب کا خالص علمی اور تحقیقی انداز قابلِ ستائش ہے تاہم اس کے مباحث پر مزید غور و فکر کے لیے کافی گنجائش موجود ہے -   (س - ش - ا)

جہادِ افغانستان اور فتحِ مبین | مرتب و مؤلف : مولانا مشتاق احمد عباسی ۔
ناشر: ادارہ صدیقیہ نزد حسین ڈی سلوا ۔ گارڈن ویسٹ نشتر روڈ کراچی ۳
ضخامت : ۲۴۰ صفحات ۔ قیمت : ۳۲/- روپے ۔

افغانستان، جو جیالے مسلمان افغانوں کی سرزمین ہے ۔ روس نے سپر پاور ہونے کے زعمِ باطل میں مبتلا ہو کر اس پر راتوں رات شب خون مارا اور یلغار کر دی ۔ اس سے پہلے برطانیہ نے بھی ایسی حماقت کی تھی ۔ برطانیہ کو جس طرح غیور افغانوں نے شکستِ فاش سے دوچار کیا ۔ اسی طرح روس کو باوجود بے سروسامانی کے افغان مجاہدین نے ایسے ناکوں چنے چبوائے کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ۔ اور دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

نہتے، بے سروسامان مجاہدین نے جدید ترین ٹیکنالوجی کا مقابلہ کس طرح کیا ؟ اس کتاب میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے ۔ حقیقی واقعات سے وابستہ یہ کتاب جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت پیدا کرنے اور بیدار کرنے کے لیے نہایت عمدہ تالیف ہے ۔

(ع ۔ و)

بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم | مؤلف : وسیم ڈار ۔ ناشر: اساس پبلشرز، پوسٹ بکس ۱۱۵۸۰ ۔ کراچی ۔ ۷۴۸۰۰ ۔ ضخامت : ۲۶ صفحات ۔ قیمت درج نہیں ۔

یہ مختصر سا پمفلٹ ہے ، جس میں مذاہبِ عالم کی مقدس کتابوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں درج بشارتوں کو بحوالہ ایک جگہ جمع کیا گیا ہے ۔ یہ بشارتیں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی واضح شہادتیں ہیں ــــــ ما شہدت بہ الاعداء کے مطابق ، مخالف کی گواہی بڑی وزنی دلیل ہے اس کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے ۔

طلع البدر | شاعر: حافظ پیر محمد ظہور علی شاہ اقدس - ناشر: تحریک اخوت اسلامیہ چوڑہ شریف - اٹک - صفحات: ۱۴۰ - سائز ۳۰×۲۰/۱۶ مجلد - قیمت: /۳۰ روپے

یہ خوبصورت نعتیہ مجموعہ ہے جس میں حافظ پیر محمد ظہور علی شاہ اقدس سجادہ نشین درگاہ چوڑہ شریف اٹک کی ایک سو آٹھ نعتیں ہیں - کتاب کا مقدمہ محترم جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب مدیر ضیائے حرم لاہور نے اور تعارف حافظ مختار احمد صاحب نے لکھا ہے اور محترم شاعر کے صاحبزادے محمد فاروق الاسلام ایم اے نے اپنے والد کی سیرت و کردار اور نعت گوئی سے گہرے شغف کے بارے میں ضروری باتیں لکھی ہیں -

نعت گوئی جس قدر باعثِ اجر و ثواب ہے، اسی قدر احتیاط اور ہوشمندی کا تقاضا بھی کرتی ہے - کیونکہ یہ ادیان کے بانیوں سے محبت کا اظہار ہی ہے - جس نے ان میں بگاڑ پیدا کیا ہے - اس کی ایک مثال مہاتما بدھ کی ذات ہے - بدھ نے بتوں کی پرستش کے خلاف جدوجہد کی، لیکن آج شاید سب سے زیادہ بت بدھ ہی کے ہیں -

اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ ہمارے نعت نگاروں میں توحید و رسالت کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی طرف سے بے پروائی بالعموم نظر آتی ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو نہ صرف مدحِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اجر کو ضائع کر دیتی ہے، بلکہ دینِ مبین میں ایک غلط رجحان کی ترویج کا باعث بھی بن رہی ہے -

مقامِ مسرت ہے کہ اس مجموعے کی نعتیں اس کمزوری سے پاک ہیں - محترم شاعر نے سیرتِ رسولؐ کو اسی طرح اہم تصور کیا ہے جس طرح وہ اہم ہے - اس احساسِ ذمہ داری اور ہوشمندی کے لیے ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں - ہمارے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ باعثِ اجر و ثواب ہوگا -

پروف پڑھنے کی طرف سے کچھ بے پروائی کا احساس ہوا - امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت یہ کمی دور کر دی جائے گی -

(ا - ن)

ماہنامہ البیان مدیر: ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی (۲-اصحاب علم و فکر کی مجلس مشاورت) سفید کاغذ پر اچھی طباعت، آرٹ کارڈ رنگین سرورق، قیمت فی پرچہ ۱۵-روپے، سالانہ زر اشتراک ۱۵۰/- روپے، مقام اشاعت ۳۴/- ۱۰ کمرشل اسٹریٹ، ڈیفنس سوسائٹی - فیز ۴ کراچی

ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب سے قارئین متعارف ہیں۔ ان کے مضامین ترجمان القرآن میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ صاحب علم و مطالعہ ہونے کی حیثیت سے ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اداری مجلس مشاورت کے افراد بھی اہم ہیں۔

جلد اول کا جو شمارہ ۶، ۷، ہمارے سامنے ہے اس میں چند علمی مضامین شامل ہیں۔ اسلامی حکومت اور اس کے خصائص (مولانا ابو الجلال ندوی) تاریخ قرآن مجید (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) دین میں غلو (مولانا عبد الغفار حسن) خلیجی قضیہ سے متعلق ۲ مضامین ہیں۔ خلیج کی جنگ (اداریہ) صدام اور کویت (مدیر سید رضوان علی) دو سفر نامے ہیں۔ استنبول سے کیمبرج تک (ڈاکٹر سید رضوان علی) سفر قاہرہ (مولانا شاہ محمد جعفر ندوی) ۲ شخصیتوں کا مختصر تذکرہ ہے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ (ڈاکٹر سید رضوان علی)، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ادارہ)

بحیثیت مجموعی اچھے مضامین ہیں۔ خلیجی معاملے میں خاصا متوازن نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ ضمناً الکویت کی تاریخ اس خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ وہ بجائے خود ایک مقالہ ہے۔

جرائد کی برادری میں اس اچھے اضافے کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔

اعتذار

تبصرہ کے لیے جمع شدہ اہم کتابوں کی کثرت کی وجہ سے متعدد پر نہیں لکھا جا سکا۔ بلکہ دو کتابوں پر زیادہ طویل تبصروں کی وجہ سے ان کو بھی خارج از اشاعت کر دیا ہے۔ پمفلٹ اور رسائل علاوہ ہیں۔ (منیجر)

رُوحِ افکارِ مودودی

جسے میجر (ریٹائرڈ) غلام محی الدین اعوان نے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" میں سے انھیں کے الفاظ میں مرتّب کیا ہے۔

	صفحات	قیمت
دنیا کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۱۹۰	۲۷/- روپے
آخرت کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۳۸۰	۵۱/- "
انسان کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۴۹۰	۶۶/- "
شیطان کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۹۸	۱۵/- "
تقدیر و مشیت کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۵۰	۷/۵۰ "
توبہ و استغفار کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۹۰	۱۲/- "
اہلِ جنت کے لیے انعامات و اکرامات کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں	۱۱۴	۱۶/۵۰ "

زیرِ طبع:

- انڈیکس تفہیم القرآن

زیرِ ترتیب:

- توحید و شرک کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں
- اہلِ دوزخ کے مصائب و تعذیبات، قرآن کی روشنی میں

- سائز: ۱۸ × ۲۳ / ۸
- کاغذ: فلائنگ
- طباعت: عکسی
- ٹائیٹل: دیدہ زیب

— اِدارہ —

ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

REGD. NO. L 5340 PHONE : 324466

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

روداد اجتماع عام

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسہ عام
- اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد، امیر جماعت اسلامی

- رپورٹ جماعت اسلامی پاکستان، ۸۳-۸۹
(قافلۂ حق کی چھ سالہ روداد سفر)
- اعلامیہ

اجتماع عام نمبر ۸۹ء

دیگر تقاریر

- دروس قرآن و حدیث
- انقلابی کردار: ایمان، جہاد اور دعوت
- انقلابی جماعت: رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ
- پاکستان میں جماعت اسلامی کا کردار
- اسلامی انقلاب میں خواتین کا کردار
- نوجوان — اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ
- ہم اس ملک میں کیا معاشی تبدیلیاں لائیں گے؟
- بین الاقوامی مندوبین

مقررین

میاں طفیل محمد	مولانا جان محمد عباسی	پروفیسر غفور احمد
چوہدری رحمت الٰہی	پروفیسر خورشید احمد	خرم مراد
نعیم صدیقی	مولانا خلیل احمد حامدی	مولانا گوہر رحمٰن
مولانا فتح محمد	حافظ محمد ادریس	لیاقت بلوچ
سید منور حسن	ایوب ٹھاکر	ڈاکٹر صیام

- ٹائیٹل، دیدہ زیب
- کتابت، کمپیوٹرائزڈ
- ضخامت، ۲۶۴ صفحات
- قیمت، -/۳۰ روپے
- لائبریری ایڈیشن، -/۴۵ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار۔ لاہور
فون: ۳۲۴۴۶۸-۶۸۶۳۶ پوسٹ بکس ۱۴۴۳